15 صفحے البقرہ ایت ۱۱۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

49

هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ

تفسیر ابنِ جریر (اردو)

تالیف

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبریؒ

ترجمہ قرآن شریف

حضرت حکیم الامتؒ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

اردو ترجمانی

ظہور الباری اعظمی

پارہ اوّل کا جزءِ دوم

مکتبہ عثمانیہ 2280 ... پیر الٰہی بخش کالونی کراچی 5

شائع کردہ

بیت الحکمت دیوبند (یو-پی)

(جملہ حقوق بنام بیت الحکمت محفوظ ہیں)

قیمت ... روپے 2/50

ضروری اعلان

جزء اول کی وصولیابی کے بعد بعض ممبران نے دفتر کو یہ شکایت لکھی ہے کہ تفسیر ابن جریر کا پورا پارہ کیوں نہیں بھیجا گیا۔ اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ چونکہ تفسیر ابن جریر ایک طویل تفسیر ہے، خصوصاً سورۂ بقرہ جو ڈھائی پاروں پر مشتمل ہے، کی تفسیر بعض خصوصیات کی وجہ سے بہت مفصّل ہے۔ اس لئے ابتدا کے تین پاروں میں ہمارے لئے یہ ممکن نہیں کہ پورا پارہ ایک قسط میں ممبران کو بھیجا جاسکے۔ ہم نے پروگرام کے اعلان واشاعت کے وقت اس کی وضاحت کردی تھی کہ ہر قسط اوسطاً سو صفحات کی ہوگی۔ ایک روپیہ چار آنے اس کی قیمت بھی متعین کردی تھی اور اس پر جو ڈاک خرچ پڑتا اس کا بھی اعلان کردیا تھا ادھر پہلا پارہ ڈھائی سو صفحہ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا قیمت اور ڈاک خرچ پر ممبران کو پورا پارہ دینا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ پہلا پارہ اگر پورا شائع کردیا جائے تو سوا روپیہ سے زیادہ صرف ڈاک خرچ پر لگ جائے گا۔ اس لئے سابقہ اعلان کے مطابق اپنی اور ممبران کی سہولت کے لئے ہم نے یہ مناسب خیال کیا کہ شروع کے تین پاروں کو مجموعی طور پر چھ اجزاء میں تقسیم کردیا جائے۔ اس کے بعد ہمیں پوری امید ہے کہ آئندہ کی باقی قسطوں میں ہر قسط پورے پارہ ہی کی رہے گی۔ انشاء اللہ پورا قرآن مجید چونتیس ۳۴ یا پینتیس ۳۵ قسطوں میں شائع کیا جاسکے گا۔

ہم نے جب شروع میں پروگرام کا اعلان کیا تھا تو وی۔ پی کا خرچ آج کل سے کم تھا۔ اس کے بعد وی۔ پی کا خرچ بھی کچھ بڑھ گیا اور کاغذ بھی گراں ہوگیا۔ لیکن ہم نے ممبران کے لئے قیمت وغیرہ میں اضافہ مناسب نہیں سمجھا تاکہ کوئی ممبر بار نہ محسوس کرے۔

ہم اپنے تمام ممبران سے اپیل کرتے ہیں کہ جب کہ وہ خود اس کے ممبر بن گئے ہیں تو قرآن مجید کی نشر واشاعت اور دوسرے دینی بھائیوں تک اسے پہنچانے اور ممبر بنانے میں بھی ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ ———— منیجر

Marfat.com

DATA ENTERED
۲۸۶
۲۹۷۰۱۶
۱۲۳۱ ت
۱۳۳۹۶
NO 2

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	وعدۂ ملاقات۔	۵
۲	ایک نیا مشغلہ۔	۶
۳	اسے بھی معاف کیا۔	۸
۴	کتاب و فرقان۔	۸
۵	توبہ	۹
۶	معاندانہ روش	۱۱
۷	دوبارہ زندگی	۱۲
۸	بادل کا سایہ	۱۵
۹	من و سلوٰی	۱۶
۱۰	واقعہ کی تفصیل	۱۶
۱۱	بستی میں داخلہ کا حکم	۱۸
۱۲	حکم عدولی	۲۰
۱۳	عذاب	۲۰
۱۴	موسیٰ علیہ السلام کا ایک معجزہ	۲۱
۱۵	نیا مطالبہ۔	۲۳
۱۶	ذلت و محتاجی کا عذاب	۲۶
۱۷	میثاق۔	۳۴
۱۸	فہمائش	۳۵
۱۹	پھر وہی تلون	۳۵
۲۰	حد سے تجاوز	۳۷
۲۱	عذاب	۴۰
۲۲	خوف خدا رکھنے والوں کے لئے نصیحت	۴۱
۲۳	گائے ذبح کرنے کا حکم۔	۴۳
۲۴	گائے کیسی ہو؟	۴۶
۲۵	بال کی کھال۔	۴۶
۲۶	اصول فقہ کا ایک مسئلہ۔	۴۸
۲۷	تیسری شرط	۴۹
۲۸	قیمت ایک گائے کی!	۵۱
۲۹	اللہ کی قدرت کے مظاہر	۵۱
۳۰	سبق	۵۳
۳۱	بدبختی نے تمہارا پیچھا نہ چھوڑا۔	۵۴
۳۲	کلمہ "او" کی تحقیق۔	۵۵
۳۳	پتھر بھی پسیج جاتا ہے	۵۶
۳۴	ان سے ایمان کی توقع ہے!	۵۷
۳۵	منافقین یہود	۶۰
۳۶	لکیر کے فقیر	۶۳
۳۷	تباہی کے راستے پر	۶۵
۳۸	بے بنیاد دعویٰ	۶۷
۳۹	قانون جزا و سزا۔	۶۹
۴۰	توحید اور عمل صالح کا عہد	۷۰
۴۱	اس سے بھی پھر گئے	۷۲
۴۲	ایک اور عہد اور اس کی خلاف ورزی۔	۷۳
۴۳	کتاب الٰہی، بینات اور روح القدس	۷۷
۴۴	تم ہمیشہ سے اپنی مرضی چلانے کے عادی ہو	۷۸
۴۵	یہ دعویٰ!	۷۹
۴۶	اللہ کی لعنت کے مظاہر	۸۰
۴۷	دوبارہ دلیری	۸۰
۴۸	انکار کی وجہ صرف حسد ہے۔	۸۲
۴۹	غضب بالائے غضب	۸۳
۵۰	یہ بھی کوئی جواب ہے۔	۸۴

Marfat.com

ضروری اعلان

جزء اول کی وصولیابی کے بعد بعض ممبران نے دفتر کو یہ شکایت لکھی ہے کہ تفسیر ابن جریر کا پورا پارہ کیوں نہیں بھیجا گیا۔ اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ چونکہ تفسیر ابن جریر ایک طویل تفسیر ہے، خصوصًا سورۂ بقرہ جو ڈھائی پاروں پر مشتمل ہے، کی تفسیر بعض خصوصیات کی وجہ سے بہت مفصل ہے۔ اس لئے ابتدا کے تین پاروں میں ہمارے لئے یہ ممکن نہیں کہ پورا پارہ ایک قسط میں ممبران کو بھیجا جاسکے۔ ہم نے پروگرام کے اعلان و اشاعت کے وقت اس کی وضاحت کر دی تھی کہ ہر قسط اوسطًا سو صفحات کی ہوگی۔ ایک روپیہ چار آنے اس کی قیمت بھی متعین کر دی تھی اور اس پر جو ڈاک خرچ پڑتا اس کا بھی اعلان کر دیا تھا ادھر پہلا پارہ ڈھائی سو صفحہ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا قیمت اور ڈاک خرچ پر ممبران کو پورا پارہ دینا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ پہلا پارہ اگر پورا شائع کر دیا جائے تو سوا روپیہ سے زیادہ صرف ڈاک خرچ پر لگ جائے گا۔ اس لئے سابقہ اعلان کے مطابق اپنی اور ممبران کی سہولت کے لئے ہم نے یہ مناسب خیال کیا کہ شروع کے تین پاروں کو مجموعی طور پر چھ اجزاء میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس کے بعد ہمیں پوری امید ہے کہ آئندہ کی باقی قسطوں میں ہر قسط پورے پارہ ہی کی رہے گی۔ انشاء اللہ پورا قرآن مجید چونتیس ۳۴ یا پینتیس ۳۵ قسطوں میں شائع کیا جاسکے گا۔

ہم نے جب شروع میں پروگرام کا اعلان کیا تھا تو وی۔ پی کا خرچ آج کل سے کم تھا۔ اس کے بعد وی۔ پی کا خرچ بھی کچھ بڑھ گیا اور کاغذ بھی گراں ہو گیا۔ لیکن ہم نے ممبران کے لئے قیمت وغیرہ میں اضافہ مناسب نہیں سمجھا تاکہ کوئی ممبر بار نہ محسوس کرے۔

ہم اپنے تمام ممبران سے اپیل کرتے ہیں کہ جب کہ وہ خود اس کے ممبر بن گئے ہیں تو قرآن مجید کی نشر و اشاعت اور دوسرے دینی بھائیوں تک اسے پہنچانے اور ممبر بنانے میں بھی ہمارے ساتھ تعاون کریں۔

مینیجر

Marfat.com

DATA ENTERED
۱۳۳۹۶

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	وعدۂ ملاقات۔	۵	۲۶	اصولِ فقہ کا ایک مسئلہ۔	۴۸
۲	ایک نیا مشغلہ۔	۶	۲۷	تیسری شرط	۴۹
۳	اسے بھی معاف کیا۔	۸	۲۸	قیمت ایک گائے کی!	۵۱
۴	کتاب و فرقان۔	۸	۲۹	اللہ کی قدرت کے مظاہر	۵۱
۵	توبہ	۹	۳۰	سبق	۵۳
۶	معاندانہ روش	۱۱	۳۱	بدبختی نے تمہارا پیچھا نہ چھوڑا۔	۵۴
۷	دوبارہ زندگی	۱۲	۳۲	کلمہ "او" کی تحقیق۔	۵۵
۸	بادل کا سایہ	۱۵	۳۳	پتھر بھی پسیج جاتا ہے	۵۶
۹	من و سلویٰ	۱۶	۳۴	ان سے ایمان کی توقع ہے!	۵۷
۱۰	واقعہ کی تفصیل	۱۶	۳۵	منافقین یہود	۶۰
۱۱	بستی میں داخلہ کا حکم	۱۸	۳۶	لکیر کے فقیر	۶۳
۱۲	حکم عدولی	۲۰	۳۷	تباہی کے راستے پر	۶۵
۱۳	عذاب	۲۰	۳۸	بے بنیاد دعویٰ	۶۷
۱۴	موسیٰ علیہ السلام کا ایک معجزہ	۲۱	۳۹	قانونِ جزا و سزا۔	۶۹
۱۵	نیا مطالبہ۔	۲۳	۴۰	توحید اور عملِ صالح کا عہد	۷۰
۱۶	ذلت و محتاجی کا عذاب	۲۶	۴۱	اس سے بھی پھر گئے	۷۲
۱۷	میثاق۔	۳۴	۴۲	ایک اور عہد اور اس کی خلاف ورزی۔	۷۳
۱۸	فہمائش	۳۵	۴۳	کتاب الٰہی، بینات اور روح القدس	۷۷
۱۹	پھر وہی تلوّن	۳۵	۴۴	تم ہمیشہ سے اپنی مرضی چلانے کے عادی ہو	۷۸
۲۰	حد سے تجاوز	۳۷	۴۵	یہ دعویٰ!	۷۹
۲۱	عذاب	۴۰	۴۶	اللہ کی لعنت کے مظاہر	۸۰
۲۲	خوف خدا رکھنے والوں کے لئے نصیحت	۴۱	۴۷	دوبارہ دلیری	۸۰
۲۳	گائے ذبح کرنے کا حکم۔	۴۳	۴۸	انکار کی وجہ صرف حسد ہے۔	۸۲
۲۴	گائے کیسی ہو؟	۴۶	۴۹	غضب بالائے غضب	۸۳
۲۵	بال کی کھال۔	۴۶	۵۰	یہ بھی کوئی جواب ہے۔	۸۴

Marfat.com

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۵۱	کھلے ہوئے معجزات کا انکار	۸۵	۵۴	جبریل علیہ السلام سے دشمنی	۹۰
۵۲	موت کی آرزو کر کے دیکھو	۸۷	۵۵	اللہ کافروں کا دشمن ہے	۹۳
۵۳	دل کا پردہ	۸۹	۵۶	روشن نشانات کا انکار نافرمان ہی کرسکتا ہے۔	۹۴

ایک قابل مطالعہ کتاب

"آلاتِ جدیدہ"

از مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہ العالی

اس کتاب میں نئی ایجادات مثلاً لاؤڈ سپیکر، گراموفون، ریڈیو، فوٹوگرافی، انجکشن اور اس کے علاوہ بہت سے آلات کے استعمال اور ان کی شرعی حیثیت پر بحث کی گئی ہے۔ لاؤڈ سپیکر پر اذان اور نماز جائز ہے یا نہیں؟ ریڈیو پر قرآن مجید کی تلاوت، تفسیر یا دوسری دینی باتیں بیان کرنے کا کیا حکم ہے۔ گراموفون کی شرعی حیثیت ٹیلی فون، ریڈیو کی خبر کا حکم۔ اگر کسی نے آیت سجدہ کی تلاوت کی تو کیا سننے والوں پر سجدہ واجب ہوجائے گا؟ سینما اور فوٹوگرافی کا حکم، انجکشن کے احکام۔ کیا انجکشن سے روزہ فاسد ہوجاتا ہے۔؟

یہ اور اس کے علاوہ آلات جدیدہ سے متعلق اور بہت سے احکام دلائل عقلی و نقلی کے ساتھ پوری تفصیل سے آپ کو اس کتاب میں ملیں گے۔ یہ کتاب ہر خاص و عام کے ہاتھ میں جانے کے قابل ہے اور سب کے لئے بہترین رہنما ہے۔

کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت ڈھائی روپے

ملنے کا پتہ

بیت الحکمت دیوبند (یو-پی)

Marfat.com

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جبکہ وعدہ کیا تھا ہم نے موسیٰؑ سے چالیس رات کا۔ پھر تم لوگوں نے تجویز کر لیا گوسالہ کو موسیٰؑ کے (جانے کے) بعد اور تم نے

ظٰلِمُوْنَ ۝ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ وَاِذْ

ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی۔ پھر بھی ہم نے تمہارے (توبہ کرنے پر) درگذر کیا تم سے اتنی بڑی بات ہوئے پیچھے اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے اور (وہ زمانہ یاد

اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

کرو) جب دی ہم نے موسیٰؑ کو کتاب (توریت) اور فیصلہ کی چیز اس توقع پر کہ تم راہ پر چلتے رہو

وعدۂ ملاقات

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً (اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ کر لیا تھا) ایک قراءت تو یہی "وٰعَدْنَا" ہے (مفاعلۃ سے) یعنی اللہ تعالیٰ اور موسیٰ علیہ السلام نے باہم عہد و پیمان کر لیا تھا۔

اس کی دوسری قراءت "وَعَدْنَا" ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا۔

پہلی قراءت کی بنیاد پر دونوں طرف سے وعدہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ طور پر ان سے مناجات کرے گا، اور موسیٰ علیہ السلام نے اپنی حاضری کی سعادت کا اظہار خوشی سے کیا تھا۔ دونوں قراءتیں اپنی اپنی جگہ درست اور حق ہیں۔ لفظ موسیٰ جیسا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے، دو الفاظ سے مرکب ہے۔ "ماء" (پانی) اور "شجر" (درخت) گویا "مو" ماء سے ہے اور "سیٰ" شجر سے ہے

آپ کا نام اس لئے پڑا جیسا کہ ہم نے سنا ہے کہ جب آپ کی والدہ نے اللہ کی وحی کے مطابق فرعون کے خوف سے آپ کو تابوت میں رکھکر دریا میں ڈال دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ دریائے نیل تھا جس میں آپ کو آپ کی والدہ نے ڈالا تھا۔ تو موجوں کے تھپیڑوں نے آپ کے تابوت کو ان درختوں کی شاخوں میں لے جا کر الجھا دیا جو فرعون کے محل سے لگے ہوئے تھے۔ فرعون کی بیوی آسیہ رضی اللہ عنہا کی باندیاں غسل کرنے کے لئے نکلیں تو تابوت انھیں ملا، انھوں نے اسے اٹھا لیا۔ چونکہ اس جگہ پانی اور درخت تھے، اس لئے آپ کو "ماء و شجر" پانی اور درخت یعنی (موسیٰ) کہا جانے لگا۔

سدی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کا نسب اس طرح بیان کیا ہے "موسیٰ بن عمران بن یصہر بن واہب بن لاوی بن یعقوب اسرائیل اللہ بن اسحاق ذبیح اللہ بن ابراہیم خلیل اللہ علیہم السلام۔

"اربعین لیلۃ" (چالیس راتوں کا) ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے جن چالیس راتوں کا وعدہ کیا تھا وہ ذیقعدہ کے پورے مہینے اور دس ذی الحجہ تک کی راتیں تھیں۔ اسی موقعہ پر موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم پر ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب بنا کر آئے تھے اور چالیس دن تک طور پر پہاڑی پر قیام کیا تھا، وہیں اللہ تعالیٰ نے آپ پر تورات، الواح پر نازل کی یہ الواح "برد" کی تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو سرگوشی کے لئے قریب بلایا اور آپ سے گفتگو کی اور آپ نے (لوح محفوظ میں) قلم چلنے کی آواز سنی۔

ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس پورے چالیس دن میں آپ کی وضو نہیں ٹوٹی، یہاں تک کہ آپ طور سے اتر آئے۔

ابن اسحاق سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک کر دیا تو موسیٰ علیہ السلام سے تیس راتوں کا وعدہ کیا بعد میں دس راتوں کا اور اضافہ کر دیا، اور اس طرح اللہ کی میقات چالیس راتوں میں پوری ہوئی۔ اس عرصہ کے لئے

Marfat.com

موسیٰ علیہ السلام ہارون علیہ السلام کو بنی اسرائیل پر اپنا نائب بنا کر گئے تھے اور فرمایا تھا کہ میں اپنے رب کے حضور میں جلدی پہنچنا چاہتا ہوں تم میرے نائب کی حیثیت سے میری قوم کی نگرانی کرنا اور فساد برپا کرنے والوں کی پیروی نہ کرنا۔

چنانچہ آپ اپنے رب سے ملاقات کے شوق میں بہت عجلت کے ساتھ روانہ ہوئے، ہارون علیہ السلام نائب کی حیثیت سے بنی اسرائیل کے ساتھ رہے۔ سامری بھی آپ کے ساتھ تھا اور وہ بنی اسرائیل کو موسیٰ علیہ السلام کے نقش قدم پر لے جانے لگا۔ تاکہ آپ کے پاس انھیں لے جائے۔

سدی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اس روایت کا ابتدائی حصہ منقول ہے۔

ایک نیا مشغلہ

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ (پھر تم نے اُن کے پیچھے گوسالہ کو اختیار کر لیا اور تم سخت ظالم تھے) یعنی جن دنوں موسیٰ علیہ السلام وعدہ کے مطابق گئے ہوئے تھے تم نے ان کی عدم موجودگی میں گوسالہ کو اختیار کر لیا تھا۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہودی مخالفین کو تنبیہ کی ہے کہ نبی کو جھٹلانا، اور ان کی مخالفت کرنا تمھارے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے تمھارے آباء اور اسلاف نے بھی انبیاء کو جھٹلایا تھا حالانکہ مسلسل اللہ تعالیٰ کے انعامات ان پر ہوتے رہتے تھے۔ پس اگر اپنے اسلاف کی طرح تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلاتے ہو اور ان کی سچائی اور صداقت کے علم کے باوجود ان کی رسالت کا انکار کرتے ہو تو اللہ تعالیٰ کی سطوت اور اس کے غضب سے محفوظ نہیں رہ سکتے کہ انبیاء کو جھٹلانے والے اور ان کی تکذیب کرنے والے تمھارے اسلاف پر بھی خدا کا عذاب مسخ، لعنت اور مختلف قسم کی ذلتوں کی صورت میں نازل ہو چکا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (موسیٰ علیہ السلام کا تعاقب کرتے ہوئے) فرعون اپنے لشکر کے ساتھ سمندر پر پہنچ چکا تھا، اس وقت وہ ایک زرد گھوڑے پر سوار تھا۔ سمندر کے کنارے تک پہنچ گیا، لیکن اس میں بنے ہوئے راستے پر گھوڑے کو چلنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اتنے میں جبریل علیہ السلام ایک مادہ گھوڑی پر سوار ظاہر ہوئے، جب گھوڑے نے اُسے دیکھا، تو اسکے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ بیان کیا کہ سامری نے (جو بنی اسرائیل کا ایک فرد تھا) جبریل علیہ السلام کو پہچان لیا، کیونکہ (اس کی پیدائش کے بعد) اس کی ماں کو خطرہ ہوا کہ اب یہ بھی (فرعونی حکم کے مطابق) قتل کر دیا جائے گا تو اسے ایک غار میں چھوڑ آئی تھی اور غار کا منہ بند کر دیا تھا۔ اس کے بعد جبریل علیہ السلام آتے تھے اور اپنی انگلیوں سے اسے غذا دیتے تھے، سامری کو آپ کی بعض انگلی سے دودھ، بعض سے شہد اور بعض سے گھی ملتا تھا، یونہی آپ اسے کھلاتے پلاتے رہے اور اسے بڑا کیا، چنانچہ جب اس نے آپ کو سمندر میں دیکھا تو پہچان گیا اور آپ کے گھوڑے کے کھُر کے نیچے سے ایک مٹھی مٹی اٹھا لی۔ اس کی سمجھ میں یہ آگیا تھا کہ اس مٹی کو جس چیز پر بھی ڈالا جائے اور چاہا جائے کہ یہ فلاں چیز بن جائے تو وہ ویسی ہی ہو جاتی ہے وہ مٹی یونہی اس کے ہاتھ میں رہی، تا آنکہ اس نے سمندر پار کر لیا۔ جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر سمندر کو پار کر گئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کے لشکر کو غرقاب کر دیا تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام سے فرمایا کہ میری قوم کی نگرانی میرے نائب کی حیثیت سے کرتے رہنا اور ان کی اصلاح کا خیال رکھنا۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کے وعدہ کے مطابق (کوہِ طور کے لئے) روانہ ہوئے

بنی اسرائیل کے پاس فرعونیوں کا ایک زیور تھا جسے انھوں نے چھپا دیا تھا۔ غالباً اس کی اپنے ساتھ موجودگی کو گناہ خیال کر کے انھوں نے اسے نکالا، تاکہ آگ آکر اسے جلا جائے[1]۔ لیکن جب تمام بنی اسرائیل اس کے لئے جمع ہوئے تو سامری نے مٹھی کی

---

[1] پچھلی امتوں میں مال غنیمت کے ساتھ یہی طرز عمل اختیار کیا جاتا تھا۔ اس کا استعمال صرف اس آخری امت کیلئے جائز قرار دیا گیا ہے، ورنہ پہلے یہ طریقہ تھا کہ اُسے میدان میں رکھ دیتے تھے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آگ آتی اور اسے جلا کر خاکستر کر جاتی (مترجم)

Marfat.com

مٹی اس زیور پر پھینک کر کہا کہ گوسالہ ہو جا، ایک ایسا جسم جس میں آواز ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہَوَا اس گوسالہ کے پیچھے سے داخل ہوتی اور آگے سے نکل جاتی، اور اس سے ایک آواز پیدا ہوتی تھی۔ سامری نے بنی اسرائیل سے کہا کہ یہ تمھارا اور موسیٰ کا معبود ہے۔ چنانچہ تمام یہودی اسی گوسالہ کی پرستش کرنے لگے۔ اس پر ہارون علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ "اے قوم کے لوگو! تم فتنہ میں پڑ گئے ہو، تمھارا رب تو رحمٰن ہے، میری اتباع کرو اور میری بات مانو" لیکن بنی اسرائیل نے یہ جواب دیا کہ ہم اس گوسالہ کی پرستش کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام ہمارے پاس واپس لوٹ آئیں۔

سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو سرزمین مصر سے ہجرت کر جانے کا حکم دیا تو آپ نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ وہ آپ کے ساتھ یہاں سے نکل چلیں، آپ نے اُن سے یہ بھی فرمایا کہ قبطیوں کے یہاں سے کچھ زیورات عاریت کے طور پر لے لیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو نجات دی اور فرعونیوں کو غرقاب کیا تو جبریل علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام کے پاس آپ کو اللہ تعالیٰ کے حضور میں لے جانے کے لئے آئے۔ آپ ایک گھوڑے پر سوار ہو کر آئے تھے، جب سامری نے اُسے دیکھا تو اُسے اس میں انفرادیت نظر آئی، اور اس نے کہا کہ یہ "فرس حیات" (زندگی کا گھوڑا) ہے، اس نے گھوڑے کو دیکھ کر کہا کہ اس کی تو ایک نرالی شان ہے پھر اس نے گھوڑے کے کھُر کے نیچے سے مٹی اُٹھالی اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام روانہ ہوئے اور ہارون علیہ السلام کو بنی اسرائیل پر اپنا نائب مقرر کیا۔ اُن سے آپ تیس راتوں کا وعدہ کر کے گئے تھے کہ یہ مدت گذار کر واپس آجائیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس میں دس کا اور اضافہ کر دیا۔ پھر ہارون علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا کہ غنیمت کا استعمال تمھارے لئے جائز نہیں ہے اور قبطیوں کے زیورات بھی مال غنیمت کے حکم میں ہیں، اس لئے قبطیوں کے جتنے زیورات تمھارے پاس ہیں انھیں جمع کر لو، اور ایک گڑھا کھود کے اس میں اسے گاڑ دو۔ موسیٰ علیہ السلام نے واپس آکر اگر اسکا استعمال تمھارے لئے جائز کر دیا تو استعمال کر لینا اور اگر جائز نہیں قرار دیا تو یونہی چھوڑ دینا چنانچہ ایک گڑھے میں انھوں نے قبطیوں کے تمام زیورات ڈال دیئے، اتنے میں سامری آیا اور اس نے وہی مٹھی بھر مٹی ان زیورات پر پھینکی، اس سے اللہ تعالیٰ نے ان زیورات سے ایک گوسالہ پیدا کر دیا جس کے جسم بے جان سے آواز نکلتی تھی۔

ادھر بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کی واپسی کی تاریخ کو یوں شمار کرنا شروع کیا کہ دن کو تو ایک دن شمار کرتے ہی تھے، رات کو بھی ایک مستقل دن کی حیثیت سے شمار کرنا شروع کر دیا۔ پھر پیسویں دن گوسالہ نکل کے باہر آگیا۔ جب بنی اسرائیل نے بھی اسے دیکھ لیا تو سامری نے ان سے کہا کہ تمھارا اور موسیٰ کا معبود تو یہی ہے، کہنے لگا کہ موسیٰ (علیہ السلام) اپنے معبود کو یہاں چھوڑ کر تلاش کرنے دوسری جگہ چلے گئے ہیں۔ اب کیا تھا، بنی اسرائیل نے اس کی عبادت شروع کر دی۔

وہ گوسالہ چل پھر سکتا تھا۔ ہارون علیہ السلام نے انھیں بہت سمجھایا کہ اے بنی اسرائیل! تم اس گوسالہ کی وجہ سے فتنہ میں ڈالے گئے ہو، تمھارا رب تو رحمٰن ہے (لیکن انھوں نے نہ مانا)، ہارون علیہ السلام اور آپ کے ساتھ جو بنی اسرائیل (حق پر تھے) انھوں نے گوسالہ پرستوں سے اس مسئلہ پر لڑائی اور جنگ نہیں کی۔

موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کے حضور میں گفتگو کرنے کے لئے حاضر ہو چکے تھے۔ جب اللہ نے آپ کو اپنے کلام سے نوازا تو یہ بھی دریافت فرمایا کہ موسیٰ! اپنی قوم کے پاس سے آپ اتنی جلدی کیوں آئے؟ عرض کی کہ میری قوم میرے پیچھے آرہی ہے، اور اے میرے رب! میں نے جلدی اس لئے کی تاکہ آپ راضی ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تمھارے آنے کے بعد تمھاری قوم کو فتنہ میں ڈال دیا، اور سامری نے انھیں گمراہ کر دیا ہے۔ پھر ان کا تمام واقعہ آپ کو بتایا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ سامری کا تعلق "باجرما" کے قبیلہ سے تھا، اس قبیلہ کے لوگ گائے کی پوجا کیا کرتے تھے، اس لئے گائے کی محبت اس کے دل میں پہلے ہی سے تھی، پھر اس نے بنی اسرائیل میں آکر اسلام

Marfat.com

کا اظہار کیا تھا۔ اس روایت میں ہے کہ زیورات کو جلانے کے لئے ہارون علیہ السلام نے آگ جلوا لی تھی۔ سامری کا نام موسیٰ بن ظفر تھا۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت میں بھی تقریباً اسی طرح واقعہ بیان ہوا ہے، جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں ہے۔

"وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ" یعنی تم اس کی عبادت کرنے لگے جو عبادت کے لائق نہیں تھا۔ کیونکہ عبادت کے لائق صرف اللہ تعالیٰ ہے اور تم نے گوسالہ کی عبادت شروع کر دی، یہ تمہارا ظلم اور حد سے تجاوز تھا۔ اس سے پہلے گزر چکا ہے کہ "ظلم" کا اصل مفہوم ہے "کسی چیز کو اس کے غیر محل میں رکھنا" اس لئے اب یہاں ہم اس کی تفصیل نہیں کریں گے۔

اسے بھی معاف کیا

"ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ" (پھر ہم نے تم کو اس کے بعد بھی معاف کر دیا کہ شاید تم شکر گذار بن جاؤ) یعنی تمہاری گوسالہ پرستی کے بعد (صرف ایک خاص گروہ کو سزا دیکر) ہم نے معاف کر دیا اور (عام) سزا نہیں دی۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے کہ تمہاری گوسالہ پرستی کے بعد بھی (ہم نے تمہیں معاف کیا) لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ یعنی تاکہ تم شکر گذار بن جاؤ۔ یہاں "لَعَلَّ" "کَیْ" کے معنیٰ میں ہے (تاکہ) آیت کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری گوسالہ پرستی کے بعد بھی ہم نے تمہیں معاف کیا تاکہ اس معافی کے نتیجہ میں (جو تم پر ایک انعام تھی) تم شکر کرو، کیونکہ کسی کی غلطی معاف کر دینا بھی دانا، اور عقلمند کے یہاں شکر کا باعث ہے۔

کتاب و فرقان

"وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ" یعنی وہ وقت بھی یاد کرو جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان دی تھی "کتاب" سے مراد "تورات" ہے اور "فرقان" سے مراد حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کرنے کی صلاحیت۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے "فرقان" کی یہی تفسیر منقول ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "کتاب" ہی "فرقان" ہے یعنی حق اور باطل کے درمیان امتیاز۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تورات، انجیل، زبور اور قرآن مجید کے مجموعہ کا نام "فرقان" ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس سلسلے میں یہ بھی روایت ہے کہ "فرقان" سے "يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ" میں اشارہ جنگ بدر کی طرف ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے حق و باطل میں امتیاز کر دیا تھا (کہ مسلمان باوجود بے سروسامانی اور قلت تعداد کے لڑائی میں کامیاب ہوئے تھے) اور اللہ تعالیٰ کا وہ فیصلہ مراد ہے جس نے حق و باطل کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا تھا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بھی "فرقان" عطا فرمایا تھا کہ جس سے انھوں نے بنی اسرائیل اور فرعونیوں میں امتیاز قائم کر دیا تھا، اور بنی اسرائیل کو بچا لائے تھے۔ ان میں یہ امتیاز و تفریق موسیٰ علیہ السلام کی کامیابی کے بعد پوری طرح واضح ہو گئی۔ یعنی جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین سے اللہ تعالیٰ نے فتح کے ذریعہ ممتاز کیا تھا، اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے ممتاز کیا، سب سے بہتر تفسیر وہ ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ابو العالیہ اور مجاہد رحمہما اللہ سے منقول ہے کہ اس آیت میں "فرقان" سے مراد وہ کتاب ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حق اور باطل کے درمیان امتیاز کر دیا تھا۔ گویا "فرقان" تورات کی صفت ہے، اور آیت میں "کتاب" بھی تورات کی صفت ہے، اور دونوں کا ایک دوسرے پر عطف کر دیا گیا ہے "کتاب" کے متعلق ہم نے اس سے پہلے ایک موقع پر تفصیل سے لکھا ہے۔ کہ "مکتوب" کے معنیٰ میں ہے۔

"لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ" کی تفسیر "لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ" کی طرح ہے، یعنی تاکہ تم راہ یاب ہو جاؤ۔ گویا مفہوم یہ ہوگا کہ یاد کرو اس وقت کو کہ جب ہم نے موسیٰ کو تورات دی جس سے حق اور باطل کے درمیان امتیاز کیا جا سکتا ہے، تاکہ تم راستہ پا جاؤ اور اس حق کی پیروی کرو جو اس کے اندر ہے ۞

Marfat.com

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ

اور وہ زمانہ یاد کرو جب موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا اپنی قوم سے کہ اے میری قوم بے شک تم نے اپنا بڑا نقصان کیا اپنی اس گوسالہ (پرستی) کی تجویز سے

فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ

سو تم اب اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو۔ پھر بعض آدمی بعض آدمیوں کو قتل کرو۔ یہ (عملدرآمد) تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ تمہارے خالق کے نزدیک

فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○

پھر حق تعالیٰ تمہارے حال پر (اپنی عنایت سے) متوجہ ہوئے بیشک وہ تو ایسے ہی ہیں کہ توبہ قبول کر لیتے ہیں

توبہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ "وہ وقت بھی یاد کرو، جب موسیٰ نے اپنی قوم بنی اسرائیل سے کہا کہ اے میری قوم! یقیناً تم لوگوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے"

بنی اسرائیل کا "اپنے اوپر ظلم" یہ تھا کہ انھوں نے وہ کام کیا تھا جو انھیں کرنا نہ چاہیئے تھا اور جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لئے سزا مقرر کی گئی۔ جو شخص بھی ایسا کام کرے جس کے نتیجہ میں اللہ کی طرف سے سزا اس پر لازم ہو جائے تو گویا وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے کہ اس نے اپنی بدعملی سے اللہ کی سزا اپنے اوپر لازم قرار دے لی۔ وہ کام جسے کر کے انھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تھا وہ ان کا ارتداد تھا کہ انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کے جانے کے بعد گوسالہ کی پوجا شروع کر دی تھی۔

پھر موسیٰ علیہ السلام نے انھیں اس گناہ کو چھوڑنے اور اللہ کی بارگاہ میں اس سے توبہ کرنے کا حکم دیا اور انھیں بتایا کہ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا جو حکم ہے اسے تسلیم و رضا کے ساتھ بجالائیں۔ آپ نے ان سے یہ بھی فرمایا کہ توبہ کی صورت یہ ہے کہ تم اپنے ہی اشخاص کو قتل کرو۔ ہم اس سے پہلے لکھ چکے ہیں کہ "توبہ" کا مفہوم یہ ہے کہ جو چیز یں اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں انھیں چھوڑ کر ان کاموں میں لگ جایا جائے جو اسے پسند ہیں اور جن سے اس کی رضا اور خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ توبہ کے سلسلہ میں موسیٰ علیہ السلام کے اس حکم کو بنی اسرائیل نے مان لیا اور اُن کے کہنے کے مطابق عمل کیا۔

ابو عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ انھوں نے گلے پکڑ لئے اور ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے سعید بن جبیر اور مجاہد رحمہما اللہ سے روایت ہے کہ بعض نے بعض کی طرف بڑھ کر ان کے گلے پکڑ لئے اور انھیں قتل کرنا شروع کر دیا، نہ کوئی کسی اپنے قریبی رشتہ دار پر ترس کھاتا تھا اور نہ کسی بھی شخص پر، آخر موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کپڑے سے اشارہ کیا تو سب نے جو کچھ بھی ان کے ہاتھوں میں تھا پھینک دیا۔ جب بعد میں جائزہ لیا گیا تو مقتولین کی تعداد ستر ہزار تھی۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ "توبہ" کے لئے اتنا بہت ہے اب قتل کا سلسلہ بند کر دیا جائے تو اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے کپڑے سے اشارہ کیا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کا حکم سنایا کہ انھیں انہوں ہی کو قتل کرنا ہے تو وہ لوگ جنھوں نے گوسالہ کی پوجا کی تھی الگ کیئے گئے اور سب کو بٹھا دیا گیا اور جو لوگ اس گناہ میں ملوث نہیں ہوئے تھے (لیکن گوسالہ پرستوں کو منع بھی نہیں کیا تھا) وہ کھڑے ہو گئے اور اپنے ہاتھوں سے ان کے گلے پکڑ لئے۔ پھر شدید اندھیرا چھا گیا اور ان میں سے بعض، بعض کو قتل کرنے لگا۔ جب اندھیرا چھٹا تو ستر ہزار مقتول پائے گئے، یہ ان لوگوں کی بھی توبہ تھی جو قتل کر دیئے گئے تھے، اور اُن کی بھی جو زندہ رہ گئے تھے۔

سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام (کوہِ طور سے) واپس آئے تو فرمایا، اے میری قوم! کیا تم سے

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے ایک اچھا وعدہ نہیں کیا تھا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے الواح (جن پر تورات لکھی ہوئی تھی) رکھدیں اور اپنے بھائی ہارون (علیہ السلام) کا سر پکڑ کر کھینچنے لگے۔ ہارون علیہ السلام نے عرض کی، میرے بھائی! میرا سر اور داڑھی پکڑ کر مجھے نہ گھسیٹیے، مجھے تو اس کا ڈر تھا کہ اگر میں نے بنی اسرائیل کو سختی سے روکا اور اس کے نتیجے میں ان میں اختلاف و نزاع پیدا ہو گیا تو، کہیں آپ واپس آکر یہ نہ کہیں کہ تم نے بنی اسرائیل میں اختلاف پیدا کر دیا اور میرا انتظار نہیں کیا، چنانچہ آپ نے ہارون علیہ السلام کو تو چھوڑ دیا، لیکن سامری کی طرف بڑھے اور فرمایا سامری! یہ تم نے کیا کیا ہے؟ پھر آپ نے اسے پکڑ کر ذبح کر دیا اور ریتی سے پھاڑ کر اس کے ٹکڑے دریا میں ڈال دیئے[1] ان دنوں جتنے بھی دریا بہتے تھے ان سب میں ان کا کچھ نہ کچھ حصہ پڑا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اب اس کا پانی پیو۔ سب نے پانی پیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ان میں جو بھی گوسالہ سے محبت رکھتا تھا اس کے موچھوں پر سونا نکل آیا۔

اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "گوسالہ کی محبت ان کے دلوں میں گھر کر گئی تھی ان کے کفر کی وجہ سے"

جب بنی اسرائیل کو اس کا احساس ہوا کہ واقعی انھوں نے گمراہی اختیار کر لی تو پھر کہنے لگے "اے ہمارے رب! اگر تو نے ہم پر رحم نہ کیا اور ہماری مغفرت نہ کی تو یقیناً ہم گھاٹے میں رہنے والوں میں سے ہو جائیں گے" لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرنے سے انکار کیا، اور حکم دیا کہ صرف اس صورت میں ان کی توبہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایسا عمل کریں جو ان پر شاق ہو، یعنی گوسالہ پرستی کرنے والے آپس میں ایک دوسرے کو قتل کریں"، پس موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ اے قوم! تم نے گوسالہ پرستی کر کے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اس لیے اپنے پیدا کرنے والے کے حضور میں توبہ کرو۔ اور اپنے آپ کو قتل کرو۔ بیان کیا کہ پھر بنی اسرائیل دو صفوں میں تقسیم ہو گئے اور ہر فریق نے اپنی تلواریں کھینچ لیں، گوسالہ پرستی کرنے والوں نے بھی اور ان لوگوں نے بھی جنھوں نے گوسالہ پرستی نہیں کی تھی۔ فریقین میں سے جو بھی قتل ہوا وہ شہید کہلایا، جب بہت بڑی تعداد قتل ہو گئی اور قریب تھا کہ سب ہلاک ہو جائیں، ستر ہزار افراد قتل ہو چکے۔ تو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے دعا کی کہ اے ہمارے رب! بنی اسرائیل سب ہلاک ہو جائینگے اے ہمارے رب! جو باقی رہ گئے ہیں انھیں باقی رہنے دیجئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی، اور انھیں ہتھیار رکھدینے کا حکم دیا۔ اس میں جتنے افراد قتل ہوئے انھیں شہادت نصیب ہوئی، اور جو زندہ رہ گئے ان کے گناہوں کا کفارہ ہو گیا۔

اس واقعہ کی طرف اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں اشارہ ہے کہ "پھر تمھاری توبہ قبول کر لی، یقیناً وہ بڑی توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا ہے"۔

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت میں ہے کہ اس معرکہ میں بیٹے نے باپ کو، اور باپ نے بیٹے کو قتل کیا تھا، جب کہیں ان کی توبہ قبول ہوئی تھی۔ ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ جب بہت بڑی تعداد قتل ہو گئی اور اندھیرا کچھ چھٹا انھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اے اللہ کے نبی! ہمارے لئے دعا کیجئے۔ موسیٰ علیہ السلام پہلے ہی سے ان کے لئے برابر دعا کر رہے تھے، آخر جب اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی تو سب کے ہاتھ روک دیئے گئے، اب سب نے ہتھیار پھینک دیئے اس حادثہ پر موسیٰ علیہ السلام بھی بہت رنجیدہ ہوئے اور بنی اسرائیل بھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی بھیجی کہ آپ رنجیدہ نہ ہوں جو لوگ قتل کر دیئے گئے ہیں وہ میرے یہاں زندہ ہیں۔ اور (جنت سے) انھیں روزی دی جاتی ہے، اور جو لوگ زندہ رہ گئے ہیں ان کی توبہ میں نے قبول کر لی ہے۔ اس سے موسیٰ علیہ السلام اور تمام بنی اسرائیل خوش ہو گئے۔

---

[1] یہ اسرائیلی روایت بالکل موضوع اور غلط ہے، سامری اس کے بعد بہت دنوں تک زندہ رہا تھا۔ البتہ موسیٰ علیہ السلام نے اس کے حق میں بد دعا کی تھی۔ (مترجم)

Marfat.com

ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت میں ہے کہ انھیں آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرنے کا حکم اس لئے ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ جان لیا تھا کہ گوسالہ پرستی کو باطل سمجھتے ہوئے بنی اسرائیل کے بعض افراد نے گوسالہ پرستوں کو اس سے صرف اس لئے نہیں روکا تھا کہ کہیں آپس میں لڑائی نہ ہو جائے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم دیا کہ بعض، بعض کو قتل کریں۔

ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ جن لوگوں نے گوسالہ کی پوجا نہیں کی تھی انھیں موسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا کہ ان لوگوں کو قتل کریں جنھوں نے گوسالہ کی پوجا کی تھی، چنانچہ پجاریوں کو باہر بٹھا دیا گیا اور دوسرے لوگوں نے انھیں قتل کرنا شروع کیا۔ موسیٰ علیہ السلام اس پر رونے لگے، عورتیں اور بچے بھی ان کے پاس جمع ہو گئے تاکہ ان کے لئے معافی مانگیں آخر ان کی توبہ قبول ہوئی اور موسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا کہ تلوار روک لیں۔

ابن زید رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ صرف ستر آدمی ایسے تھے جنھوں نے ہارون علیہ السلام کے ساتھ گوسالہ پرستی نہیں کی تھی۔ آپ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ ان پر بادل بھیجے گئے تھے (جس سے ایسا اندھیرا چھا یا کہ) بہتوں نے اپنے باپ اور بھائی کو قتل کر ڈالا اور (اندھیرے کی وجہ سے) انھیں احساس نہ ہوا۔ بیان کیا کہ جو لوگ قتل ہوئے انھیں شہادت کا درجہ ملا اور جو باقی رہ گئے ان کی توبہ قبول ہوئی۔ ان کا یہی عمل ان کے حق میں گوسالہ پرستی سے توبہ بن گیا، اس لئے فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ کا مطلب یہ ہوگا کہ اپنے خالق کی طاعت و بندگی طرف واپس آجاؤ اور وہی کام کرو جس سے وہ خوش اور راضی ہو۔ ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ کے متعلق فرمایا کہ "باری" کے معنیٰ خالق کے ہیں بَرَأَ اللّٰهُ الْخَلْقَ، یبرأہ (اصل معنی چیرنا، پیدا کرنا ہے) اسم فاعل "باری" ہے "بریّۃ" مخلوق کو کہتے ہیں۔

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ یعنی اپنوں کو قتل کر کے تمھاری توبہ [illegible] اور اپنے رب کی اطاعت و فرمانبرداری تمھارے حق میں تمھارے پیدا کرنے والے کے نزدیک بہتر ہے کیونکہ اس کی وجہ سے تم آخرت میں اللہ کے عذاب سے بچ جاؤ گے، بلکہ تمھیں اس پر ثواب ملیگا۔

فَتَابَ عَلَيْكُمْ (یعنی تمھارے اس عمل کو جس کا اس نے تمھیں حکم دیا تھا کہ تم میں سے بعض، بعض کو قتل کرے (اس نے قبول کرلیا) فَتَابَ عَلَيْكُمْ (یعنی جو تم چاہتے تھے کہ تمھارے گناہوں سے تمھیں معافی مل جائے اور جو عظیم جرم تم نے کیا ہے اس سے درگذر کیا جائے تو تمھارے رب نے تمھارے ساتھ ایسا ہی کیا اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ جو شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں، اس کی طاعت و فرمانبرداری کے جذبے کے ساتھ حاضر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔

"الرَّحِيْمُ" یعنی اس پر رحمت کرتا ہے اور اسے اپنے عذاب و عتاب سے نجات دیتا ہے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ

اور جب تم لوگوں نے (یوں) کہا کہ موسیٰ ہم ہرگز نہ مانیں گے تمھارے کہنے سے یہاں تک کہ ہم (خود) دیکھ لیں اللہ تعالیٰ کو اعلانیہ طور پر سو (اس گستاخی پر) آپڑی تم پر

وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۵۶)

اور تم (اس کا آنا) آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر ہم نے تم کو زندہ کر اٹھایا تمھارے مرجانے کے بعد اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے۔

معاندانہ اور غیر معقول روش

"وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً" یعنی وہ وقت یاد کرو جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ! ہم تمھاری تصدیق ہرگز نہ کریں گے، اور جو کچھ تم اللہ کی طرف سے لائے ہو، اس کا اقرار ہرگز نہ کریں گے، جب تک ہم اللہ کو علانیہ نہ دیکھ لیں، یعنی

Marfat.com

ہمارے اور اللہ کے درمیان میں کوئی پردا نہ رہے اور ہم اپنی انھیں ناسوتی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو خود جب تک نہ دیکھ لیں (صرف آپ کے کہنے سے نہیں مانیں گے) جھرت الرکیۃ (کنوئیں کا پانی دکھائی دینے لگا) اس وقت بولتے ہیں جب پہلے سے پانی پر مٹی پڑی رہی ہو، پھر مٹی کو اس طرح نکالا گیا ہو کہ پانی صاف آ گیا ہو اور اچھی طرح دکھائی دینے لگا ہو۔ جہر، اجہر، جہرًا وجہرۃ: "جہر فلان بھذا الامر" (اس نے بلند آواز سے بات کی) جب کوئی شخص کسی چیز کا برسرعام اعلان کرے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے "جہرۃ" کی تفسیر "علانیۃ" منقول ہے۔ قتادہ اور ربیع رحمۃ اللہ علیہما سے بھی یہی نقل ہوا ہے۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "حتیٰ نری اللہ جھرۃ" یعنی جب تک اللہ تعالیٰ ہمارے سامنے نہ آئے (ہم ایمان نہ لائیں گے)

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کے آباء اور اسلاف کے اختلافات اور انبیاء پر ایمان میں عدم استقامت کا ذکر کیا ہے، حالانکہ وہ اکثر اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو دیکھا کرتے تھے ان سے ان کے دلوں کا خلجان دور ہو جانا چاہیئے تھا اور تصدیق وایمان پر استقامت و اطمینان حاصل ہو جانا چاہیئے تھا، اللہ تعالیٰ کے انعامات بھی ان پر بہت ہوا کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ کبھی اپنے نبی سے یہ مطالبہ کر بیٹھتے کہ اللہ کے علاوہ ان کے لئے کچھ اور معبود بنا دیئے جائیں، کبھی خود اللہ کو چھوڑ کر گوسالہ کی پوجا کرنے لگتے، کبھی کہتے کہ جب تک ہم خود اللہ تعالیٰ کو دیکھ نہ لیں آپ کی تصدیق نہیں کریں گے، کبھی اگر انھیں کفار سے جنگ کے لئے بلایا جاتا تو کہتے کہ تم اور تمھارا رب جاکے لڑ لو، ہم تو یہیں بیٹھے ہوئے ہیں، اس کے علاوہ اپنے نبی کے ساتھ وہ دوسری بہت سی بے ہودہ اور غیر معقول روش کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان آیات میں ان کے واقعات کو بیان کر کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے یہودیوں کو تنبیہ کرتا ہے کہ اب پھر اپنے اسلاف کی روش کو زندہ نہ کریں، جو تھوڑی دیر کے لئے دین میں داخل ہو جاتے تھے اور پھر ارتداد اختیار کر لیتے تھے، کبھی موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ توبہ کر لیتے اور پھر توڑ دیتے، حالانکہ اللہ تعالیٰ انھیں بڑی بڑی آزمائشوں میں مبتلا کرتا رہتا تھا اور ساتھ ہی اپنے پے بہ پے انعامات سے بھی نوازتا رہتا تھا۔ فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (اس پر آ لیا تم کو "صاعقہ" نے اور تم اس کا آنا دیکھ رہے تھے) "صاعقۃ" کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ کی تفسیر صرف اتنی نقل ہوئی ہے کہ "وہ مر گئے" ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انھوں نے ایک آواز سنی جس سے وہ گر پڑے اور پھر مر گئے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ صاعقہ ایک آگ تھی۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انھیں زلزلہ نے لیا۔ زلزلہ ہی "صاعقہ" ہے۔ اس سے وہ سب مر گئے۔

"صاعقہ" ہر اس ہولناک حادثہ کو کہتے ہیں جسے اگر کوئی دیکھ لے یا اس میں مبتلا ہو جائے تو بات موت تک پہنچ جائے یا پھر عقل جاتی رہے، یا جسم کا کوئی عضو معطل اور بے کار ہو جائے خواہ یہ حادثہ آواز کی صورت میں ہو یا آگ یا زلزلہ کی صورت میں نمودار ہو، ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ "صاعقہ" سے دوچار ہونے کے بعد آدمی کی موت نہ واقع ہو، موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وَخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا (کوہ طور پر موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر صرف بے ہوشی طاری ہوئی، آپ کی روح قبض نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ اسی ذیل میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "جب موسیٰ ہوش میں آئے تو کہا کہ میں تیری بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں" لیکن یہاں پر آیت کا مفہوم وہی ہے جو ہم نے بیان کیا۔

وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ یعنی تم اس "صاعقہ" کو دیکھ رہے تھے جس نے تم کو آ لیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ صاعقہ نے تمھیں علانیہ آ لیا تھا اور تم اس کے آنے کو دیکھ رہے تھے۔

دوبارہ زندگی	ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (پھر ہم نے تمھیں جلا اٹھایا تمھارے

Marfat.com

مرنے کے بعد، کہ شاید تم شکرگذار بنو) "بعثنا کم" یعنی ہم نے تمہیں جلا اُٹھایا۔ "بعث" کا اصل مفہوم کسی چیز کو اس کی جگہ سے اٹھانا اور ابھارنا ہے، اسی سے بولتے ہیں: "بَعَثَ فُلَانٌ رَاحِلَتَہٗ" جب کوئی شخص سواری کو اس کے باندھنے کی جگہ سے سفر کے ارادہ سے اٹھائے۔ "بَعَثْتُ فُلَانًا لِحَاجَتِیْ" یعنی میں نے فلاں کو اپنی ایک ضرورت کی وجہ سے اس کی جگہ سے اٹھایا۔ قیامت کے دن کو بھی "یوم بعث" اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ اس دن سب کو حساب کے لئے ان کی قبروں سے اٹھایا جائے گا "من بعد موتکم" یعنی صاعقہ سے تمہاری موت کے بعد "لعلکم تشکرون" یعنی ہم نے تمہارے ساتھ یہ معاملہ اس لئے کیا تاکہ تم اس نعمت پر شکر کرو جو ہم نے تمہاری موت کے بعد تمہیں زندہ کر کے کیا ہے، ہم نے تمہاری اس گستاخی کی سزا تمہیں صاعقہ کے ذریعہ دیدی تھی۔ لیکن توبہ کے لئے تمہیں پھر زندہ کیا تاکہ اپنے عظیم گناہ سے اپنے رب کی بارگاہ میں رجوع کرو۔ آیت کی یہ تفسیر اس بنیاد پر ہوئی ہے کہ "بعثناکم" کا مطلب "ہم نے تمہیں جلا اٹھایا" کیا گیا ہے۔ بعض حضرات نے "بعثناکم" کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "ہم نے تم میں انبیاء پیدا کئے" یہ روایت سدی رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔ اس تفسیر کی بنیاد پر مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ پھر تمہیں "صاعقہ" نے آلیا، پھر ہم نے تمہیں تمہاری موت کے بعد زندہ کیا، درانحالیکہ تم موت کے بعد اپنے زندہ ہونے کو دیکھ رہے تھے پھر ہم نے تم میں انبیاء پیدا کئے تاکہ تم شکرگذار بنو"۔

لیکن یہ تفسیر آیت کی ظاہری ترتیب کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ تفسیر صحیح نہیں سدی رحمۃ علیہ کی تفسیر کی بنیاد پر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ شکرگذاری کی وجہ یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں انبیاء پیدا کئے تھے "لن نؤمن لک حتی نری اللہ جہرۃً" کے سلسلہ میں تفصیلی واقعہ محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے یہ مروی ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام (تورات لیکر) واپس اپنی قوم کے پاس آئے تو انھوں نے دیکھا کہ یہاں گوسالہ کی پوجا ہو رہی تھی۔ پھر آپ نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام اور سامری سے جو کچھ کہنا تھا کہا، گوسالہ کو جلا دیا اور اسے دریا میں پھینک دیا۔ اس کے بعد اپنی قوم کے ستر افراد اپنے ساتھ لئے جو سب سے بہتر اور پوری قوم میں منتخب تھے۔ آپ نے ان سے فرمایا کہ اللہ عزوجل کے حضور میں چلو اور اپنے اس عمل سے توبہ کرو جو تم نے کیا ہے (یعنی گوسالہ پرستی) اور اپنی قوم کے دوسرے ان افراد کے لئے بھی توبہ کی درخواست کرو جو تمہارے ساتھ نہیں آسکے ہیں، روزہ رکھو، پاکیزگی اختیار کرو اور اپنے کپڑے پاک صاف کرلو۔ چنانچہ آپ ان سب کو ساتھ لیکر طور سینا کی طرف روانہ ہوئے، جہاں آپ کے رب نے آپ سے ملاقات کا وعدہ کیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہاں جب بھی آتے تو اللہ کی اجازت سے آتے (ابن اسحاق نے کہا کہ) مجھ سے روایت بیان کرنے والوں نے جیسا کہ بیان کیا ہے، موسیٰ علیہ السلام کی ہدایات کے مطابق جب انھوں نے عمل کر لیا اور اللہ سے ملاقات کے لئے نکلے تو آپ سے یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ آپ ہمارے رب کو ہمارے پاس ہی بلا دیں تاکہ ہم اپنے رب کی گفتگو خود سن سکیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، ایسا ہی ہو جائے گا۔ چنانچہ جب آپ پہاڑی کے قریب پہونچے تو بادل چاروں طرف سے لانے لگے اور پوری پہاڑی بادلوں میں چھپ گئی۔ موسیٰ علیہ السلام بالکل قریب پہونچ گئے اور بادلوں کے اندر چلے گئے۔ آپ نے قوم سے بھی فرمایا کہ قریب آجاؤ۔ موسیٰ علیہ السلام جب اپنے رب سے گفتگو کرتے تو آپ کی پیشانی پر ایک چمکدار نور نمودار ہو جاتا تھا۔ کسی بھی انسان میں اتنی طاقت نہیں ہوتی تھی کہ اس کی طرف دیکھ سکے، قوم کے افراد قریب پہونچ گئے اور جب بدلی کے اندر چلے گئے تو سجدہ میں گر پڑے۔ اس وقت انھوں نے سنا کہ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو کر رہا تھا۔ انھیں کچھ چیزوں کا حکم دے رہا تھا اور کچھ چیزوں سے منع کر رہا تھا کہ فلاں فلاں کام کرو اور فلاں نہ کرو۔ جب یہ گفتگو ختم ہوئی اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے بادل چھٹے تو آپ اپنی قوم کے ان ستر افراد کی طرف متوجہ ہوئے۔ لیکن انھوں نے فوراً ہی یہ مطالبہ رکھ دیا "کہ ہم آپ پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کو علانیہ نہ دیکھ لیں" اس وقت

Marfat.com

انھیں کڑک یعنی صاعقہ نے آلیا اور وہ تمام وہیں مر گئے۔ اب موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کے حضور میں روتے گڑگڑاتے اور دعا کرنے لگے کہ اے میرے رب! اگر تو چاہتا تو اس سے پہلے ہی انھیں اور مجھے ہلاک کر سکتا تھا۔ انھوں نے واقعی بے وقوفی کی تھی، تو کیا یہ بیوقوفوں کے کرتوت کی پاداش میں میرے پیچھے جو بنی اسرائیل رہ گئے ہیں انھیں بھی ہلاک کر دے گا؟ مطلب یہ تھا کہ یہ چیز تو تمام بنی اسرائیل کی بربادی کا باعث بن جائے گی۔ کیونکہ میں ان کے ستر منتخب اور ان میں سب سے بہتر افراد اپنے ساتھ لایا تھا، تاکہ وہ ان کے پاس واپس جاکر (میری تصدیق کریں) لیکن اب ان میں کوئی بھی زندہ نہیں ہے، اب میری تصدیق وہ کس بنیاد پر کریں گے۔ موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے یہی دعائیں کرتے رہے اور آخر کار ان کی دعا قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے انھیں دوبارہ زندہ کر دیا۔ پھر آپ نے بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی سے توبہ کی درخواست پیش کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ توبہ اس وقت تک قبول نہیں ہوگی جب تک وہ اپنے ہی آدمیوں کو قتل نہ کرلیں۔

سدی رحمۃ اللہ علیہ سے اس سلسلہ میں جو روایت ہے اس کی ترتیب اس طرح ہے کہ جب بنی اسرائیل نے گوسالہ پرستی سے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ان کے ہاتھوں انھیں کے آدمی قتل ہوئے اور بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی تو پھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کے چند افراد کو ساتھ لیکر میرے پاس آؤ اور وہ لوگ گوسالہ پرستی سے توبہ اور معذرت کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے ملنے کے لئے جگہ اور وقت متعین کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں سے ستر افراد منتخب کئے اور توبہ کے لئے روانہ ہوئے۔ جب متعینہ جگہ پر پہونچے تو بنی اسرائیل کے ان افراد نے یہ طالبہ شروع کر دیا کہ ہم اس وقت تک آپ پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک علانیہ اللہ تعالیٰ کو خود نہ دیکھ لیں۔ آپ نے گفتگو تو کر لی، لیکن اب ہمیں دکھا بھی دیجئے، اس وقت انھیں دیکھتے ہی غش آگیا اور وہ سب مر گئے۔ موسیٰ علیہ السلام رونے لگے اور اللہ سے دعا کرنے لگے کہ اے میرے رب! بنی اسرائیل کو میں کیا جواب دوں گا، ان میں جو منتخب تھے انھیں بھی تو نے ہلاک کر دیا۔ میرے رب! اگر تو چاہتا تو انھیں اور مجھے اس سے پہلے ہلاک کر سکتا تھا۔ کیا اب سب کو بے وقوفوں کے عمل کی وجہ سے ہلاک کر دے گا؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی۔ یہی ستر افراد وہ ہیں جنھوں نے گوسالہ کو معبود بنایا تھا، اسی واقعہ کی طرف اشارہ قرآن مجید کی آیت میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے کہا "یہ صرف تیری طرف سے آزمائش ہے تو جسے چاہے اس کے ذریعہ گمراہ کرے اور جسے چاہے اس کے ذریعہ ہدایت دے، بلاشبہ ہم نے تیرا راستہ پا لیا ہے"۔ اور اسی واقعہ کی طرف اشارہ قرآن مجید کی اس آیت میں ہے کہ "اور جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ، ہم آپ پر اس وقت تک ایمان نہ لائینگے جب تک اللہ تعالیٰ کو علانیہ نہ دیکھ لیں تو انھیں صاعقہ نے آلیا" آخر اللہ تعالیٰ نے انھیں زندہ کر دیا اور ایک ایک کر کے اسطرح زندہ ہوتے رہے کہ ان میں سے بعض، بعض دوسرے ساتھیوں کو دیکھ رہا تھا کہ کس طرح انھیں زندہ کیا جا رہا ہے۔ پھر بنی اسرائیل کے ان افراد نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے جو بھی دعا کرتے ہیں وہ قبول ہوتی ہے، اس لئے ہمارے لئے دعا کیجئے کہ اللہ ہماری قوم میں انبیاء پیدا کرتا رہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا بھی کی اور ان میں انبیاء پیدا ہوئے آیت "ثم بعثناکم من بعد موتکم" (پھر ہم نے تمہیں تمہاری موت کے بعد جلا اٹھایا) میں اسی کی طرف اشارہ ہے، لیکن سدی رحمۃ اللہ علیہ نے واقعہ کی ترتیب الٹ دی ہے۔ واقعہ کے جو اجزاء پہلے تھے انھیں مؤخر کر دیا اور جو بعد میں تھے انھیں مقدم کر دیا۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام ان الواح کو لیکر واپس آئے جن میں توریت لکھی ہوئی تھی تو دیکھا کہ انھوں نے گوسالہ کی پوجا شروع کر رکھی ہے اس لئے آپ نے اپنوں ہی کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ انھوں نے اس حکم کی تعمیل کی اور اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کر لی۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ ان الواح میں اللہ کی کتاب ہے اس میں کچھ چیزوں کا اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے اور بعض چیزوں سے روکا ہے۔ اس پر وہ کہنے لگے کہ تنہا آپکی بات

Marfat.com

کون مان لے گا، ہرگز نہیں، خدا کی قسم جب تک اللہ تعالیٰ ہمارے سامنے نہ آجائے اور ہم علانیہ اسے نہ دیکھ لیں ..... وہ ہم سے خود کہدے کہ یہ میری کتاب ہے تم اس پر عمل کرو۔ آخر وہ خود ہم سے کیوں نہیں کہتا۔ اس پر اللہ کا غضب ان پر نازل ہوا اور صاعقہ نے انھیں آلیا۔ یہ توبہ کے بعد کا واقعہ ہے۔ چنانچہ سب مر گئے، پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں زندہ کیا۔ آپ نے اس کے بعد یہ آیت پڑھی "ثم بعثناکم من بعد موتکم لعلکم تشکرون" (پھر ہم نے تمہاری موت کے بعد تمہیں جلا اٹھایا تاکہ تم شکرگذار بنو) اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے ان سے پھر کہا کہ اب اللہ کی کتاب پر ایمان لاؤ۔ لیکن انھوں نے اب بھی انکار کیا، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، تمہیں کچھ احساس بھی ہے، ابھی تم پر کیا گذری تھی؟ انھوں نے کہا کہ ہم پر موت طاری ہو گئی تھی اور پھر ہمیں زندہ کیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا تو اللہ کی کتاب پر ایمان لاؤ، لیکن وہ انکار ہی کرتے رہے اس پر اللہ تعالیٰ نے اتپر فرشتے بھیجے جنھوں نے ان کے اوپر پہاڑ معلق کر دیا۔

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے مختصر طور پر اور ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ سے نسبتاً تفصیل کے ساتھ روایتیں اسی کے مطابق ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل نے کہا تھا کہ "لن نؤمن لک حتی نری اللہ جہرۃً" تو بنی اسرائیل کے اس مطالبہ کی وجہ ہم نے جن مختلف روایات میں نقل کی ہے وہ اس درجہ کی نہیں ہیں کہ ان کے متعلق یقین اور وثوق کے ساتھ کہہ سکیں کہ واقعی وہ صحیح بھی ہیں۔ ہمارے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ جو مطالبات انھوں نے کئے تھے ان کا ایک جزیہ بھی رہا ہو۔ لیکن چونکہ اس سلسلہ میں کوئی قطعی اطلاع ہمارے پاس نہیں اس لئے مناسب یہی ہے کہ تفسیر میں صرف اس پر اکتفا کیا جائے کہ بنی اسرائیل نے یہ مطالبہ کیا تھا (کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کو علانیہ دکھاؤ) اور یہاں اس واقعہ کا ذکر اس لئے ہوا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے یہودیوں کو تنبیہ کرنی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر واضح اور روشن دلائل کے باوجود تم کفر اور انکار کئے جا رہے ہو، آیت کا مقصد بھی اسی حد تک ہے، اس کے بعد اس کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ بنی اسرائیل کے مطالبہ "لن نؤمن لک حتی نری اللہ جہرۃً" کے سبب کی تلاش کی جائے: جو روایات اس سلسلہ میں ذکر ہوئی ہیں ہم ان سب کا علی الاعلان انکار نہیں کرتے، ممکن ہے ان میں بعض صحیح ہوں۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ ۖ كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ

اور سایہ افگن کیا ہم نے تم پر ابر کو (میدان تیہ میں) اور (غیب سے) پہنچایا ہم نے تمہارے پاس ترنجبین اور بٹیریں، کھاؤ نفیس چیزوں سے جو کہ ہم نے

مَا رَزَقْنَاكُمْ ۚ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٥٧﴾

تم کو دی ہیں ..... اور اس سے انھوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا لیکن اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

بادل کا سایہ

"وظللنا علیکم الغمام" (اور ہم نے تمہارے اوپر بادل کا سایہ کیا) وظللنا علیکم کا عطف "ثم بعثناکم من بعد موتکم" پر ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے تمہیں تمہاری موت کے بعد جلا اٹھایا اور ہم نے تم پر بادل کا سایہ کیا۔ اس کے علاوہ ان پر اپنے اور بہت سے انعامات کا ذکر کیا ہے تاکہ تم شکرگذار بن جاؤ۔ "غمام" غمامۃ کی جمع ہے جیسے سحاب، سحابۃ کی۔ "غمام" ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو آسمان کو چھپا لے۔ بادل، لڑائی وغیرہ میں اٹھنے والا غبار اور اس کے علاوہ اس طرح کی بہت سی ایسی چیزوں پر اس کا اطلاق صحیح ہے جس سے آسمان، انسان کی نظر سے چھپ جاتا ہو۔ ہر چھپی ہوئی چیز کو اہل عرب "مغموم" کہتے ہیں۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ "غمام" جس کا بنی اسرائیل پر سایہ کیا گیا تھا وہ کوئی بادل نہیں تھا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے کہ غمام بادل نہیں، بلکہ وہ ایک ایسی چیز تھی جس میں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جلوہ افروز

Marfat.com

ہوں گے۔ ایک روایت میں آپ سے ہے کہ وہ بمنزلہ بادل کے تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی روایت ہے کہ غمام دنیا کے بادل سے زیادہ ٹھنڈی اور خوشگوار چیز ہے، قیامت کے دن اس میں اللہ تعالیٰ آئیں گے اور بدر کی لڑائی کے موقعہ پر مسلمانوں کی مدد کے لئے فرشتے اس میں آئے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہی "غمام" بنی اسرائیل کے ساتھ میدان تیہ[1] میں تھا۔

منّ وسلویٰ "وانزلنا علیکم المن والسلویٰ" (اور ہم نے تمہارے اوپر منّ وسلویٰ اتارا) مفسرین کے اس سلسلہ میں مختلف اقوال ہیں کہ منّ وسلویٰ کیا چیز ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ "من" گوند ہے، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "من" بنی اسرائیل پر اولے کی طرح گرا کرتا تھا۔ ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ من ایک مشروب تھا، شہد جیسا، اور بنی اسرائیل پر اترا کرتا تھا، بنی اسرائیل اس میں پانی ملا کر پیتے تھے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ من ترنجبین ہے۔ چنانچہ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ ترنجبین[2] کے درختوں پر گرا کرتا تھا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ من ان کے درختوں پر گرا کرتا تھا، بنی اسرائیل جب صبح کو اٹھتے تو انھیں ملتا تھا اور جتنا چاہتے اس میں سے کھاتے تھے۔ عامر رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے کہ وہ درختوں پر گرتا تھا۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ من شہد تھا جو آسمان سے ان کے لئے گرتا تھا۔ عامر رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت میں منقول ہے کہ من تمہارے اس شہد سے ستر درجہ زیادہ میٹھا ہوتا تھا۔ بعض حضرات نے تو یہ کہا ہے کہ من ترنجبین کو کہتے ہیں اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ ایک خاص قسم کی گھاس پر گرا کرتا تھا اور شہد سے زیادہ میٹھا ہوتا تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ یہ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا، سانپ کی چھتری بھی من میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھوں کے لئے شفا بخش ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ من، ایک میٹھا مشروب تھا، بنی اسرائیل اسے پکا کر پیتے تھے ....

"سلویٰ" ایک پرندہ ہے جو بٹیر کی طرح کا ہوتا ہے، واحد اور جمع دونوں کے لئے یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ بعض حضرات کا خیال ہے کہ سلویٰ جمع ہے، واحد "سلواۃ" ہے، ابن مسعود، ابن عباس اور بعض دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم سے یہی روایت ہے کہ سلویٰ ایک بٹیر جیسا پرندہ ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ سلویٰ، بٹیر سے بڑا ہوتا تھا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے صرف اتنی روایت ہے کہ یہ ایک پرندہ تھا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ ایک ایسا پرندہ تھا جسے بنی اسرائیل کی طرف جنوب سے ہوائیں لاتی تھیں۔ وہب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ سلویٰ ایک قریب پرندہ تھا، کبوتر کی طرح۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ ایک پرندہ تھا۔ ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بٹیر جیسا تھا۔ عامر اور ضحاک رحمہم اللہ اور ایک روایت میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بٹیر ہی کا دوسرا نام سلویٰ ہے۔

واقعہ کی تفصیل اللہ تعالیٰ نے جن حالات میں بنی اسرائیل پر بادل کا سایہ کیا اور ان پر منّ وسلویٰ بھیجا اس سے متعلق مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے قوم موسیٰ کی توبہ

---

[1] یعنی جزیرہ نمائے سینا میں، جہاں ریگستان اور چٹیل میدان کے سوا اور کچھ نہیں تھا، اور جہاں آفتاب اور دھوپ کی تپش سے انسان کا زندہ رہنا مشکل تھا۔ جب بنی اسرائیل وہاں پہونچے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں تپش اور گرمی سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنی رحمت سے بادل کا سایہ کیا۔ (مترجم)

[2] ترنجبین کے متعلق قدیم طب کی کتابوں میں لکھا ہے کہ شہد کی طرح جمی ہوئی لذیذ اور آسمان سے گرنے والی شبنم کی قسم کی چیز ہے (مترجم)

Marfat.com

قبول کرلی اور ان ستر افراد کو زندہ کر دیا جو منتخب ہو کر موسیٰ علیہ السلام کی ساتھ گئے تھے اور جن پر اللہ تعالےٰ نے موت طاری کر دی تھی تو انہیں سرزمین "اریحا" جو بیت المقدس کا علاقہ ہے، کی طرف روانگی کا حکم دیا، چنانچہ تمام قوم روانہ ہوئی. جب اریحا کے قریب پہنچ گئے تو موسیٰ علیہ السلام نے بارہ نقیب منتخب کر کے (اریحا کے حالات معلوم کرنے کیلئے) بھیجے. ان نقیبوں، اریحا کی طاقت ور اور ظالم قوم اور موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا واقعہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر کر دیا ہے (جس کی تفصیل آگے آئے گی) بالآخر موسیٰ علیہ السلام کی قوم (بنی اسرائیل) نے کہدیا کہ تم اور تمہارا رب، دونوں جاؤ اور ان سے جنگ کرو ہم یہیں بیٹھے ہیں. موسیٰ علیہ السلام کو بہت غصہ آیا اور آپ نے ان کے لئے بد دعا کی اور عرض کی کہ اے میرے رب! میں اپنے اور اپنے بھائی کے سوا اور کسی کا مالک نہیں ہوں، پس تو میرے اور فاسق قوم (بنی اسرائیل) کے درمیان جدائی کر دے. اس بد دعا میں موسیٰ علیہ السلام نے کچھ عجلت کی. بہر حال اللہ تعالےٰ نے حکم دیدیا کہ سزاءً مقدس سرزمین کو انپر چالیس سال تک حرام کر دیا گیا ہے. جب اس میدان میں بھٹکتے رہنا ان کے لئے مقدر کر دیا گیا تو موسیٰ علیہ السلام کو بہت افسوس ہوا، ادھر آپ کی قوم کے وہ افراد بھی آئے جو آپ کے ساتھ تھے اور آپ کی اطاعت کرتے تھے، انہوں نے کہا موسیٰ آپ نے یہ ہمارے لئے کیا کیا ہے؟ جب موسیٰ علیہ السلام کو غم اور افسوس ہوا تو اللہ تعالےٰ نے اُن سے فرمایا کہ "لَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ" یعنی جنھیں آپ فاسق کہہ چکے ہیں اُنپر غم نہ کھایئے. موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ان سے اب مطالبہ شروع کیا کہ ہمیں اس چٹیل میدان میں پانی کہاں سے ملے گا؟ کھانا ہم کہاں سے کھائیں گے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے "من" اُتارا جو ترنجبین کے درخت پر گرا کرتا تھا اور سلویٰ اُتارا جو بٹیر کی طرح کا ایک پرندہ تھا. کیفیت یہ تھی کہ بنی اسرائیل کا کوئی فرد آتا اور ان پرندوں کو دیکھتا کہ اگر فربہ ہوتے تو انھیں ذبح کر لیتا ورنہ چھوڑ دیتا جب پرندہ فربہ ہو جاتا تو خود ہی وہاں آجاتا تھا. بنی اسرائیل نے اس کے بعد کہا کہ کھانا تو مل گیا، لیکن پانی کہاں سے حاصل ہوگا؟ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پتھر پر مارا جس سے بارہ چشمے جاری ہو گئے اور بنی اسرائیل کے (بارہ قبیلوں میں سے) ہر قبیلے کے لئے ایک چشمہ متعین کر دیا گیا. اب بنی اسرائیل نے مطالبہ کیا کہ کھانا اور پانی ہمیں دونوں مل گئے، لیکن سایہ کہاں ملے گا؟ اسپر اللہ تعالےٰ نے اُن پر بادل سے سایہ کیا. پھر انہوں نے کہا کہ سایہ بھی حاصل ہو گیا، لیکن ہم پہنیں گے کیا؟ اس کے بعد ان کا کپڑا اسی کے مطابق بڑھتا رہتا، جیسے جیسے بچے بڑے ہوتے اور پھٹتا بھی نہیں تھا. اللہ تعالےٰ کے ارشاد "وظللنا علیکم الغمام وانزلنا علیکم المن والسلویٰ" اور ایک دوسرے موقعہ پر "واذ استسقیٰ موسیٰ لقومہ فقلنا اضرب بعصاک الحجر فانفجرت منہ اثنتا عشرۃ عینا قد علم کل اناس مشربہم" میں یہی واقعات بیان کئے گئے ہیں. ابن اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کی توبہ (گوسالہ پرستی سے) قبول کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ انہیں بیت المقدس لے جائیں، اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ میں نے وہاں کا قیام ان کے لئے مقدر کر دیا ہے اس لئے آپ وہاں جایئے اور جو ظالم اور آپ کے دشمن اس سرزمین پر قبضہ کئے ہوئے ہیں انھیں وہاں سے نکال باہر کیجئے، میں اُن کے خلاف آپ کی مدد کروں گا. موسیٰ علیہ السلام اللہ کے حکم کے مطابق ارض مقدس کیطرف روانہ ہوئے، جب تیہ (جزیرہ نماء سینا) میں پہنچے جو مصر اور شام کے درمیان میں واقع ہے اور جہاں کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں تھی اور نہ کہیں سایہ تھا، تو موسیٰ علیہ السلام نے سورج کی تپش سے پریشان ہو کر دعا کی اور اللہ تعالےٰ نے بادل سایہ کے لئے بھیجا، پھر آپ نے بنی اسرائیل کیلئے روزی کی دعا کی تو اللہ تعالےٰ نے من وسلویٰ بھیجا. ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ چالیس سال کی متعینہ مدت ان پر اس طرح پوری ہوئی کہ من وسلویٰ اُنپر اُترتا تھا اور ان کے کپڑے بوسیدہ نہیں ہوتے تھے، ان کے ساتھ طور پہاڑی کا پتھر تھا، جب کہیں قیام کرتے تو موسیٰ علیہ السلام اس پر اپنا عصا مارتے اور اس سے بارہ چشمے نکل آتے. وھب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اس سلسلے میں ایک مفصل روایت اسی طرح کی ہے ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی سدی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح روایت منقول ہے. ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ اگر کوئی شخص ایک دن سے زیادہ کے لئے من وسلویٰ لے لیتا تو دوسرے دن وہ سڑ جاتا تھا، البتہ جمعہ کے دن اگر سنیچر کے لئے وہ پکڑتے تو نہیں سڑتا تھا، "کلوا من طیبات ما رزقنٰکم" (کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دے رکھی ہیں) یعنی ہم نے اُن سے کہا تھا کہ من وسلویٰ کی صورت میں جو روزی ہم نے تمہیں دے رکھی ہے اسے خوب فراخی کے ساتھ کھاؤ. اس کا تذکرہ پہلے ہی اس انداز میں ہو رہا تھا کہ کُلُوْا (ہم نے کہا)

Marfat.com

کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی. مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہیں جو روزی دے رکھی ہے، اس میں سے اپنی خواہش کے مطابق جی بھر کے کھاؤ بعض مفسرین نے یہ تفسیر کی ہے کہ "من طیبات ما رزقناکم" کا مطلب ہے کہ جو رزق ہم نے تمہارے لئے حلال کی ہے (اس میں سے کھاؤ) لیکن بہتر تفسیر پہلی ہی ہے، کیونکہ تذکرہ روزی کی فراخی اور وسعت کا چل رہا ہے جو اللہ تعالٰے نے اپنے فضل سے بنی اسرائیل کو عطا فرمائی تھی، پھر اس کی صفت "طیب" بیان کی ہے، اس لئے اس کے معنے لطف و آرام اور فراخی و وسعت لینا. حلال و مباح سے زیادہ بہتر ہے۔ "ما رزقناکم" کا "ما" الذی کے معنی میں ہے یعنی "جو" پاکیزہ روزی ہم نے تمہیں دی ہے اس میں سے کھاؤ۔ "وما ظلمونا ولکن کانوا انفسہم یظلمون" (اور انہوں نے زیادتی ہم پر نہیں کی، بلکہ زیادتی اپنی ہی جانوں پر کرتے رہے) یہاں بھی واقعہ کی ایک کڑی چھوڑ دی گئی ہے۔ کیونکہ جس نہج پر واقعہ بیان ہو رہا ہے اس میں اس کے بیان کی کوئی ضرورت نہیں تھی، وہ کلام سے خود بخود ظاہر تھی۔ واقعہ کی تفصیل اس طرح ہے کہ، ہم نے ان سے کہا کہ کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دے رکھی ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں ہم نے جو انھیں حکم دیا تھا انہوں نے اس کے خلاف کیا، اپنے رب کی نافرمانی کی اور ہمارے رسول کا کہنا نہیں مانا (یعنی ہم نے من و سلویٰ کی ذخیرہ اندوزی سے منع کیا تھا، لیکن وہ ذخیرہ کرنے لگے) اور انہوں نے اپنے اس فعل سے ہم پر کوئی زیادتی (ظلم) نہیں کی، بلکہ اپنے ہی اوپر زیادتی کرتے رہے۔ یعنی انہوں نے اپنے اس فعل سے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا، نقصان خود اپنا ہی کر لیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی آیت میں "ظلم" مضرت اور نقصان کے معنی میں منقول ہے، ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ "ظلم" کسی چیز کو اس کے حقیقی مقام سے اٹھا کر دوسری غیر مناسب جگہ رکھ دینے کو کہتے ہیں۔ یہاں اللہ تعالٰے نے بتایا ہے کہ کسی گنہگار کے گناہ سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا کسی ظالم کے ظلم سے اس کے خزانوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا اسی طرح سے کسی اطاعت کرنے والے کی اطاعت کسی انصاف کرنے والے کے انصاف سے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ گنہگار اور ظالم اپنے گناہ اور ظلم سے خود اپنا نقصان کرتے ہیں فرمانبردار اور عادل اپنی فرمانبرداری اور عدل سے خود اپنا بھلا کرتے ہیں۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ

اور یاد کرو، جب کہ ہم نے حکم کیا کہ تم لوگ اس آبادی کے اندر داخل ہو پھر کھاؤ اس (کی چیزوں) میں سے جس جگہ تم رغبت کرو بے تکلفی سے اور (یہ بھی حکم دیا کہ) دروازے میں داخل ہونا عاجزی سے

سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۚ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ

جھکے جھکے اور زبان سے یہ کہتے جانا کہ توبہ ہے توبہ ہے، ہم معاف کر دینگے تمہاری پچھلی خطائیں اور ابھی مزید براں اور دینگے دل سے نیک کام کرنے والوں کو۔ سو بدل ڈالا ان ظالموں نے ایک

ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ

اور کلمہ جو خلاف تھا اس کلمہ کے جس (کے کہنے) کی ان سے فرمائش کی گئی تھی اس پر ہم نے نازل کی ان ظالموں پر ایک آفت سماوی اس وجہ سے کہ

السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝

وہ عدول حکمی کرتے تھے

بستی میں داخلہ کا حکم

"واذ قلنا ادخلوا ھذہ القریۃ" (اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے کہا تھا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ) جیسا کہ ہم سے روایتیں بیان کی گئیں، جس بستی (قریۃ) میں بنی اسرائیل کو داخلہ کا حکم ہوا تھا وہ بستی "بیت المقدس" ہے۔ قتادہ اور سدی رحمۃ اللہ علیہما سے روایت ہے کہ مراد بیت المقدس ہے۔ ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اس سے مراد "اریحا"[1] ہے جو بیت المقدس کے مضافات میں ایک بستی تھی۔ "فکلوا منہا حیث شئتم رغدا" یعنی اس بستی

[1] حاشیہ نمبر ایک صفحہ ۱۹ پر دیکھیے۔

ں جہاں سے جی چاہے خوب فراخی اور وسعت کے ساتھ کھاؤ پیو۔ " رغد" کا مفہوم اس سے پہلے ہم بیان کر آئے ہیں۔ " وادخلوا الباب سجدا "
اور دروازہ شہر میں عاجزی سے جھکتے ہوئے جانا (شہر پناہ کے جس دروازے سے انہیں داخل ہونے کا حکم ہوا تھا اس کے متعلق روایت
ہے کہ وہ بیت المقدس کا " باب الحطۃ " ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہا اور مجاہد و سدی رحمۃ اللہ علیہما سے یہی روایت ہے۔ " سجدا " کے متعلق ابن عباس
رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ " جھکتے ہوئے " آپ نے فرمایا کہ انہیں حکم ہوا تھا کہ چھوٹے دروازہ سے جھکتے ہوئے اندر داخل ہوں۔ " سجود "
تعظیماً جھکنا، تعظیم کی غرض سے ہر جھکنے والے کو " ساجد " کہہ سکتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر کے مطابق " سجدہ " سے یہاں مراد ،
رکوع " یعنی جھکنا ہے، اگرچہ سجدہ کے مفہوم میں رکوع کی بہ نسبت زیادہ جھکنا پایا جاتا ہے " وقولوا حطۃ " (اور کہتے جانا توبہ ہے)
حِطَّۃٌ " فِعلۃ کے وزن پر " حَطَّ اللّٰہُ عَنْكَ خَطَایَاكَ " سے ماخوذ ہے (اللہ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے) مفسرین کے اس کے مفہوم کے
سلسلہ میں کئی اقوال ہیں۔ حسن و قتادہ رحمہما اللہ نے فرمایا " حطۃ " یعنی ہماری غلطیوں کو معاف کر دے۔ ابن زید اور ابن جریج سے بھی
یہی تفسیر منقول ہے۔ دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ " قولوا حطۃ " کا مطلب ہے کہ " لاالٰہ الا اللہ کہتے جانا " اس تفسیر سے یہ مفہوم نکلتا ہے
اس کا نام لیتے جانا جو تمہارے گناہ معاف کرتا ہے۔ یہ تفسیر عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اسے استغفار کے
معنی میں لیا ہے۔ ایک روایت میں آپ سے یہ مفہوم منقول ہے کہ " یہی حق ہے " ابن عباس رضی اللہ عنہ کے دونوں اقوال بھی مفہوم اور مقصد
میں عکرمہ رضی اللہ عنہ کی تفسیر کی طرح ہیں، نحوی اعتبار سے " حطۃٌ " کے رفع کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ مبتدا محذوف کی خبر ہے: عبارت
یوں ہوگی " دخولنا الباب سجدا حطۃ " اس محذوف پر دلالت آیت " وادخلوا الباب سجدا " کرتی ہے۔ اس لئے اس کو فوراً دوبارہ ذکر
کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی اور کلام سے اسے حذف کر دیا گیا۔ میری یہ توجیہ ربیع بن انس، ابن جریج اور ابن زید رحمہم اللہ کی تفسیر
کی بنیاد پر ہے۔ کیونکہ عکرمہ رضی اللہ عنہ کی تفسیر کی بنیاد پر " حطۃ " پر نصب ہوگا۔ کیونکہ ان کی تفسیر کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل سے کہا گیا
تھا کہ " قولوا لاالٰہ الا اللہ " یا " قولوا نستغفر اللہ " اس طرح " حطۃ " قولوا کا مفعول ہوگا۔ حسن و قتادہ رحمہما اللہ کی تفسیر کی بنا پر بھی " حطۃ " کو
نصب ہوگا۔ لیکن ان کی تفسیر میں یہ مفعول مطلق ہے، مصدر کو فعل کی جگہ پر رکھا گیا ہے۔ " نغفر لکم خطایاکم " یعنی ہم تمہاری غلطیوں کو اپنی رحمت
سے ڈھانک لیں گے تمہاری ستر پوشی کریں گے اور تمہاری ان غلطیوں پر تمہیں سزا دے کر تمہیں رسوا نہیں کریں گے۔ " غفر " کا اصل مفہوم
ڈھانک لینا اور ستر پوشی کرنا ہے، جو چیز بھی کسی دوسری چیز کو چھپا لے اسے " غافر " کہہ سکتے ہیں۔ لوہے کی خود کو بھی اسی لئے " مِغفَر "
کہتے ہیں کہ وہ سر کو چھپا لیتی ہے۔ " غفر " اس کپڑے کو کہتے ہیں جو شرمگاہ کو ڈھانک لے۔ " خطایاکم " میں " خطایا " خطیۃ کی جمع ہے
جیسے مطایا، مطیۃ کی اور حشایا حشیۃ کی جمع ہے۔ یہ فَعِیلَۃٌ کے وزن پر " خطی الرجل " (خطا اور غلطی کرنے کے معنی میں) ہے۔ " وسنزید المحسنین "
ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر یہ منقول ہے کہ جو تم میں نیک کار رہیں، ہم ان کو زیادہ ہی دیتے ہیں اور جو تم میں خطا کار رہیں ہم ان کی
غلطیوں کو معاف کرتے ہیں " اس طرح آیت، واذ قلنا ادخلوا ھٰذہ القریۃ " کی تفسیر یہ ہوگی کہ جتنی بھی پاکیزہ چیزیں اس بستی میں ہیں وہ
سب تمہارے لئے مباح ہیں پوری فراخی کے ساتھ ان کا استعمال کرو، تم پر اس کا کوئی حساب نہیں، اور دروازہ (شہر) میں
عاجزی سے جھکتے ہوئے داخل ہونا اور کہتے ہوئے جانا کہ ہمارا یہ جھکنا اللہ کے لئے ہے تاکہ وہ ہماری خطاؤں کو معاف کر دے اور
انھیں چھپا دے، (اگر تم نے ایسا کیا تو) ہم تمہاری خطاؤں کو اپنی رحمت سے ڈھانک لیں گے، ان کی پردہ پوشی کریں گے اور جو سزا اس کی

سلہ یہ فلسطین کا مشہور شہر ہے، موجودہ نقشوں میں [illegible] کے نام سے ملے گا۔ یہ بحر مردہ کے شمالی ساحل سے پانچ میل کے فاصلہ پر واقع
ہے۔ اسے بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت یوشع کے زمانہ میں فتح کیا تھا۔ اس سے پہلے کے واقعات وہ تھے جو حضرت
موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں پیش آئے تھے۔ اگر قریہ (بستی) سے مراد " اریحا " لیا جائے تو یہ واقعہ حضرت یوشع علیہ
السلام کے زمانے کا ہوگا۔ قرآن مجید واقعات صرف عبرت و نصیحت کے لئے ذکر کرتا ہے۔ اس لئے اس میں تاریخی ترتیب کی تلاش
فضول ہوگی (مترجم)

Marfat.com

وجہ سے نہیں ہو سکتی تھی، ہم اسے ختم کر دیں گے اور جو تم میں نکو کار ہیں ان پر اپنے سابقہ احسانات کے ساتھ ہم اور زیادہ انھیں دیتے ہیں اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی جہالت، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے انحراف اور ہر طرح کا احسان و انعام کے باوجود انبیاء کا مذاق اور ان کی نافرمانی کا ذکر کیا ہے۔ مقصد ان یہودیوں کو ڈرانا ہے جو ان کی اولاد تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے کہ تم بھی اپنے اسلاف کے نقش قدم پر نہ چلو ورنہ تمہارا بھی وہی حشر ہوگا جو ان کا ہوا۔

حکم عدولی

"فبدل الذین ظلموا قولاً غیر الذی قیل لہم" (مگر ان ظالموں نے جو انھیں بتایا گیا تھا اس کے خلاف ایک اور کلمہ بدل ڈالا) "الذین ظلموا" (ان ظالموں نے) سے مراد وہ لوگ (بنی اسرائیل) ہیں جنھوں نے وہ کام کیا تھا جو انھیں کرنا نہ چاہئے تھا۔ "قولاً غیر الذی قیل لہم" کا مفہوم یہ ہے کہ جو انھیں حکم تھا اسے نہیں کہا، بلکہ اس کے خلاف دوسرا کلمہ کہا۔ یہی وہ تغیر اور تبدیلی تھی جسکا انھوں نے ارتکاب کیا تھا۔ ایک کلمہ کہنے کا انھیں حکم ہوا تھا، لیکن اس کے بجائے انہوں نے دوسرا کلمہ کہا ان کی یہ تبدیلی قولی تھی (عملی نہیں) اس سلسلے میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ شہر کے دروازے میں جھکتے ہوئے جانا اور کہتے جانا، تو یہ ہے، تو ہم تمہاری خطاؤں کو معاف کر دیں گے۔ لیکن انہوں نے اس کے خلاف کیا اور دروازے میں سرین کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے اور (بجائے حطۃ کے) "حبۃ فی شعرۃ" (ایک بے معنی جملہ) کہا۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس دروازے میں انھیں عاجزی سے جھکتے ہوئے داخل ہونے کا حکم ہوا تھا اس میں وہ سرین کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے اور یہ کہتے ہوئے کہ "حنطۃ فی شعیرۃ" ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری روایت میں "حطۃ" کی تفسیر کے سلسلے میں روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، انھوں نے "حطۃ" کے بجائے "حنطۃ" کہا تھا۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ انہوں نے یہ کلمہ کہا تھا "حنطۃ حمراء فیھا شعیرۃ" ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ شہر کا دروازہ چھوٹا تھا اور انھیں اس میں عاجزی سے جھکتے ہوئے داخل ہونے کا حکم ہوا تھا۔ لیکن وہ سرین کے بل داخل ہوئے اور "حنطۃ" کہا یہ تبدیلی انہوں نے استہزاء اور مذاق کے طور پر کی تھی۔ حسن اور مجاہد رحمہما اللہ سے بھی یہی روایت ہے، مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ وہ سرین کے بل اس پہاڑ تک گئے جسپر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے لئے تجلی کی تھی۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے (عبرانی زبان میں) الفاظ کہے تھے "حطا سمقایا ازبۃ حبا" اس کا ترجمہ یہ ہے کہ سرخ رنگ کے گیہوں جن پر سیاہ داغ پڑے ہوں"۔ ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ بعضوں نے اپنے کمال کے بل سجدہ کیا، حطۃ کے بجائے حنطۃ کہا اور بعض نے "حبۃ فی شعیرۃ" کہا۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا مذاق بنانے کے لئے انہوں نے یہ سب کچھ کیا تھا۔

عذاب

"فانزلنا علی الذین ظلموا رجزاً من السماء بما کانوا یفسقون" (سو ہم نے ان ظلم کرنے والوں پر ایک عذاب آسمان سے نازل کیا، اس سبب سے کہ وہ نافرمانی کرتے رہے تھے) "فانزلنا علی الذین ظلموا" یعنی ان لوگوں پر جنھوں نے وہ کام کیا جو نہ کرنا چاہئے تھا کہ انہوں نے اس قول کو بھی بدل دیا جس کا اللہ نے انھیں حکم دیا تھا، اس کے حکم کی خلاف ورزی کی اور جس سے روکا تھا اسے کیا، تو ہم نے ان کے اس فسق کی وجہ سے ان پر آسمان سے "رجز" نازل کیا۔ "رجز" لغت عرب میں عذاب کو کہتے ہیں۔

طاعون کے سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں رجز کے یہی معنی ہیں، آپ نے فرمایا تھا کہ "اِنَّہٗ رِجْزٌ عُذِّبَ بِہٖ بَعْضُ الْاُمَمِ الَّذِیْنَ قَبْلَکُمْ" (وہ ایک رجز ہے جس کے ذریعہ تم سے پہلے کی بعض امتوں کو عذاب دیا گیا تھا) چنانچہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ بیماری (طاعون کی) رجز ہے، تم سے پہلے بعض امتوں کو اس کے ذریعہ عذاب دیا گیا تھا، ایک دوسری روایت میں تعیین کے ساتھ بنی اسرائیل کا ذکر بھی ہے کہ یہ عذاب انھیں پر نازل ہوا تھا) یہی خیال مفسرین کا بھی ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے رجز کی تفسیر "عذاب" اور ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے "غضب" نقل ہوئی ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل

Marfat.com

کی اس نافرمانی کے نتیجہ میں اللہ تعالےٰ نے انہیں طاعون پھیلا دیا اوران کا کوئی فرد بھی زندہ باقی نہ بچا اس کے بعد آپ نے آیت "فانزلنا علی الذین ظلموا الخ" پڑھی، آپ نے فرمایا کہ البتہ اُن کے بچے باقی رہ گئے اور یہی صاحب فضل وخیر اور عبادت گذار ہوئے جنکی وجہ سے بنی اسرائیل کی تعریف کی جاتی ہے، ان بچوں کے باپ دادا طاعون میں ہلاک ہوگئے تھے، آپ سے بھی "رجز" کا معنی عذاب ہی منقول ہے آپ نے فرمایا کہ قرآن میں جہاں بھی "رجز" ہے عذاب ہی کے معنی میں ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی منقول ہے کہ قرآن میں جہاں بھی رجز ہے عذاب ہی کے معنی میں ہے۔ اتنی بات تو بہرحال ثابت ہے کہ رجز، عذاب کے معنی میں ہے۔ اللہ کا عذاب مختلف صورتوں میں نازل ہو سکتا ہے، ہمیں اللہ تعالےٰ نے صرف اتنا بتایا ہے کہ ان لوگوں پر جن کا ذکر اوپر ہوا آسمان سے ایک عذاب نازل ہوا تھا، ممکن ہے یہ عذاب طاعون رہا ہو ممکن ہے کہ اس کے علاوہ کسی دوسری صورت میں نازل ہوا ہو، قرآن اس سلسلے میں بالکل خاموش ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ جن لوگوں کا اس آیت میں ذکر ہوا ہے ان پر کس طرح کا عذاب نازل ہوا تھا۔ اس لئے ہمارے لئے مناسب یہی ہے کہ ہم بھی اتنی ہی بات کہیں جو اللہ تعالےٰ نے فرما دی ہے کہ "ان ظلم کرنے والوں پران کی نافرمانی کے سبب آسمان سے عذاب نازل ہوا" اگرچہ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے جو تفسیر منقول ہے وہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے، کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں بھی طاعون کا ذکر ہے اور آپ نے یہ فرمایا کہ ہم سے پہلے کسی قوم کو اس کے ذریعہ عذاب دیا گیا تھا۔ لیکن میں اس سلسلے میں یقین کے ساتھ کوئی بھی دعویٰ نہیں کر سکتا کیونکہ حضور اکرم کے ارشاد میں اس کی کوئی وضاحت نہیں کہ یہ عذاب کس قوم پر نازل ہوا تھا، ہوسکتا ہے کسی اور قوم پر یہ عذاب نازل ہوا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہی لوگ رہے ہوں جن کا ذکر اوپر آیا ہے کہ انہوں نے اللہ کے حکم کے خلاف کیا اور جس کلمہ کو انھیں کہنے کا حکم ہوا تھا اسے بدل ڈالا۔ "بما کانوا یفسقون"۔ یعنی اس سبب سے کہ وہ اللہ کی طاعت سے انحراف کرتے تھے، اس کے حکم کے خلاف عمل کرتے تھے اور اس کی معصیت کرتے تھے۔ ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ "فسق" کا اصل مفہوم کسی چیز سے نکل جانا ہے،

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا

اور جب (حضرت) موسٰےؑ نے پانی کی دعا مانگی اپنی قوم کیواسطے اسیر ہمنے (موسیٰؑ) کو حکم دیا کہ اپنی اس عصا کو فلاں پتھر پر مارو (اس سے پانی نکل آئے گا) پس (مارنے کی دیر تھی کہ) فوراً اُس سے

عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ

پھوٹ نکلے بارہ چشمے (اور بارہ ہی خاندان تھے بنی اسرائیل کے چنانچہ) معلوم کرلیا ہر شخص نے اپنے پانی پینے کا موقع (اور ہم نے یہ نصیحت کی کہ) کھاؤ اور پیو اللہ تعالےٰ کے رزق سے اور

وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝

حد (اعتدال) سے مت نکلو فساد (وفتنہ) کرتے ہوئے سرزمین میں

موسیٰ علیہ السلام کا ایک معجزہ

"واذا ستسقٰی موسیٰ لقومہ" اصل عبارت یوں ہے "واذا ستسقانا موسیٰ" یعنی (وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی کی دعا مانگی۔ یہاں مفعول کی ضمیر "نا" (ہم سے) کو ذکر نہیں کیا، کیونکہ اس کے ذکر کے بغیر بھی وہ کلام میں سمجھی اور تسلیم کی جاتی ہے۔ اسی طرح اس کے بعد کی آیت "فقلنا اضرب بعصاک الحجر فانفجرت منہ اثنتا عشرۃ عینًا" میں الحجر کے بعد "فضربہ" ذکر نہیں کیا گیا، کیونکہ اس کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور وہ اس کے بغیر بھی کلام میں سمجھا اور تسلیم کیا جاتا ہے۔ مفہوم یہ ہے "پس ہم نے کہا (اے موسیٰ) اپنا عصا پتھر پر مارو (انہوں نے اس پتھر پر اپنا عصا مارا) تو اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ "قد علم کل اناس مشربہم" میں بھی یہی صورت ہوئی ہے، یہاں "منہم" کا ذکر نہیں ہوا ہے

Marfat.com

مفہوم یہ ہے۔ "اور (ان کے) ہر گروہ نے اپنا گھاٹ معلوم کر لیا" ہم نے پہلے لکھا تھا کہ "ناس" ایسی جمع ہے جسکے لفظ سے اس کا کوئی واحد نہیں ہے، انسان کی اگر لفظی جمع بنائی جائے تو "اناسین" یا "اناسیۃ" آ سکتی ہے (ناس کے وزن پر اس کی کوئی جمع نہیں بن سکتی) قوم موسیٰ سے مراد وہی بنی اسرائیل ہیں جن کے واقعات ان آیات میں بیان ہو رہے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے پانی کی دعا اس وقت کی تھی جب وہ میدان "تیہ" میں حیران و سرگرداں تھی، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ اس میدان میں بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے پیاس کی شکایت کی۔ چنانچہ انھیں طور سے ایک پتھر اٹھا لانے کا حکم ہوا، تاکہ موسیٰ علیہ السلام اس پر اپنا عصا ماریں۔ وہ اسے اٹھا کر لائے اور جب نیچے اُترے تو موسیٰ علیہ السلام نے اس پر اپنا عصا مارا اس کے نتیجے میں بارہ چشمے پھوٹ پڑے، ہر قبیلہ کے لئے ایک چشمہ متعین ہو گیا، پانی ان میں سے خوب نکلتا رہتا تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی روایت ہے کہ یہ واقع میدان تیہ کا ہے، فرمایا یہیں اللہ تعالےٰ نے ان پر بادل کا سایہ کیا تھا، یہیں من و سلویٰ نازل کیا تھا، اسی میدان میں ان کے کپڑے ایسے کر دیئے تھے جو نہ بوسیدہ ہوتے تھے اور نہ میلے ہوتے تھے، یہیں ان کے لئے ایک چوکھٹے پتھر پر موسیٰ علیہ السلام سے اپنا عصا مارنے کے لئے کہا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے عصا اس پر مارا تو بارہ چشمے پھوٹ پڑے، ہر کنارے پر تین تین چشمے تھے اور ہر قبیلہ کے لئے ایک چشمہ متعین تھا، بنی اسرائیل جب کبھی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے۔ تو وہ پتھر بھی ان کے ساتھ رہتا۔ مجاہد اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہما سے بھی تقریباً اسی طرح کی روایت ہیں۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے پانی کے ان بارہ چشموں کی خاص طور سے اطلاع اسلئے دی ہے کہ پہاڑ اور زمین میں سے پانی نکلنے کے جو متعارف اور عام طریقے ہیں، اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کے لئے میدان تیہ میں اس سے الگ ایک نئے طریقے سے پانی نکالا تھا۔ ہر قبیلہ اپنے اپنے چشمہ سے واقف تھا اور صرف اپنے ہی چشمہ سے پانی لیتا تھا، اور اس کے باوجود کہ سارے چشمے اسی ایک پتھر سے نکلے تھے، انھیں اپنے اپنے چشموں کو پہچاننے میں کوئی مغالطہ نہیں ہوتا تھا۔ اللہ تعالےٰ نے خصوصیت کے ساتھ اسی لئے آیت میں اسکا ذکر کیا ہے کہ "ان میں کا ہر شخص اپنے چشمہ سے واقف تھا"۔ "کلوا واشربوا من رزق اللہ" (کھاؤ پیو اللہ کے (دیئے ہوئے) رزق میں سے) اس آیت کا مفہوم بھی سابقہ آیتوں کی طرح ہوگا، یعنی ہم نے کہا کہ اپنا عصا پتھر پر مارو انہوں نے مارا، تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے اور ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ معلوم کر لیا، پھر ہم نے اُن سے کہا کہ کھاؤ اور پیو اللہ کے دیئے ہوئے رزق سے"۔ اللہ تعالےٰ اطلاع دے رہا ہے کہ اس نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ انھیں تیہ کے لق و دق ریگستان میں جو من و سلویٰ مل رہا ہے اسے کھائیں اور اس پتھر کے شیریں چشموں سے جو کسی ایک جگہ نہیں ٹھہرا رہتا۔ اور جسے صرف ان کے مالک ہی استعمال کر سکتے ہیں، خوب پیئیں۔ اپنے انعامات اور اپنی حلال کی ہوئی روزی کے ذکر کے بعد اللہ تعالےٰ بنی اسرائیل سے اب صرف ایک مطالبہ کرتا ہے کہ زمین پر فساد نہ پھیلاتے پھرو اور غرور و سرکشی میں حد سے نہ بڑھو، "ولا تعثوا فی الارض مفسدین" یعنی اور زمین میں فسادی بن کر مت پھرو اور شر و فساد میں حد سے آگے مت بڑھو" ابوالعالیہ، ابن زید اور قتادہ رحمہم اللہ سے یہی تفسیر نقل ہوئی ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بھی یہی قول ہے۔ "عثا" (جس سے تعثوا نکلا ہے) کا اصلی مفہوم "فساد پھیلانے میں انتہائی سرگرمی کا مظاہرہ کرنا اور حد سے آگے بڑھ جانا" ہے۔ بولتے ہیں "عَاثَ فُلَانٌ فِی الْاَرْضِ" یعنی فلاں شخص فساد پھیلانے میں اپنی حد سے آگے بڑھ گیا۔ کلام عرب میں "عثا" اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

13396

وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُخْرِجْ لَنَا

اور جب تم لوگوں نے (یوں) کہا کہ اے موسیٰ (روز کے روز) ہم ایک ہی قسم کھانے پر کبھی نہ رہیں گے (یعنی من سلویٰ پر) آپ ہمارے واسطے اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لئے

مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۚ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ

ایسی چیزیں پیدا کریں جو زمین میں اُگا کرتی ہیں ساگ (ہوا) ککڑی (ہوئی) گیہوں (ہوا) مسور (ہوئی) پیاز (ہوئی)۔ آپ نے فرمایا کیا تم عوض میں لینا چاہتے ہو

Marfat.com

الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَ

ادنیٰ درجے کی چیزوں کو ایسی چیز کے مقابلہ میں جو اعلیٰ درجہ کی ہے. کسی شہر میں جاکر اترو (وہاں) البتہ تم کو وہ چیزیں ملیں گی جن کی تم درخواست

ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ ۗ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ

کرتے ہو اور جم گئی ان پر ذلت اور پستی (کہ دوسروں کی نگاہ میں قدر) اور خود ان میں اولوالعزمی نہ رہی اور مستحق ہو گئے غضب الٰہی کے (اور) یہ اس وجہ سے (ہوا) کہ وہ لوگ منکر ہو جاتے

بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا یَعْتَدُوْنَ۠ ۝

تھے احکام الٰہیہ کے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو (کہ وہ قتل خود ان کے نزدیک بھی) ناحق (ہوتا تھا) اور (نیز) یہ (ہو) اس وجہ سے (ہوا) کہ ان لوگوں نے اطاعت نہ کی اور دائرہ (اطاعت) سے نکل نکل جاتے تھے.

نیا مطالبہ

اس سے پہلے ہم صبر کا مفہوم بتا چکے ہیں کہ نفس کو اس کی مرغوب چیزوں سے روکے رکھنے کا نام ہے. اسی لئے "واذ قلتم یا موسیٰ سے وبصلها" تک آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ " اور اے معشر بنی اسرائیل! وہ وقت یاد کرو جب تم نے کہا تھا کہ ہم ہرگز ایک کھانے پر اپنے نفس کو نہیں روک سکتے." وہ ایک کھانا جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل کو میدان تیہ میں مہیا کیا جاتا تھا. بعض روایتوں کے مطابق "سلویٰ" ہے، لیکن وھب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ وہ کھانا "گوشت کے ساتھ ملی ہوئی خشک روٹی" تھی. " پس اپنے رب سے ہمارے لئے وہ چیزیں مانگئے جنھیں زمین اگاتی ہے، یعنی ساگ ککڑی" اور دوسری بہت سی سبزیاں جن کا آیت میں ذکر ہوا ہے. ان کے اس مطالبہ کی وجہ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بیان کی ہے کہ بنی اسرائیل ریگستان میں تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان پر بادل کا سایہ کیا تھا اور ان پر من وسلویٰ نازل کیا تھا، بنی اسرائیل اس سے اکتا گئے اور اس زندگی کو یاد کرنے لگے جو انھیں مصر میں حاصل تھی. پھر اپنی یہ خواہش انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے بیان کی تو اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ "کسی شہر میں اتر پڑو، جو کچھ تم مانگتے ہو وہیں مل جائے گا" ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے، آپ نے فرمایا کہ کھانے کے لئے انھیں وہاں "سلویٰ" ملتا تھا اور پینے کے لئے "من" قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت میں ہے کہ جب بنی اسرائیل شام پہنچے تو انھیں وہ غذائیں ملیں جن کے وہ پہلے سے عادی تھے. اس لئے انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ " ہمارے لئے اپنے رب سے وہ چیزیں مانگئے جنھیں زمین اگاتی ہے، ساگ، ہوا، ککڑی، ہوئی، گیہوں ہوا، مسور ہوئی، پیاز ہوا" اس سے پہلے ان پر بادل کا سایہ رہتا تھا اور من وسلویٰ ان کے لئے اترتا تھا، وہ اس سے اکتا گئے تھے اور مصر کی زندگی انھیں یاد آنے لگی تھی. ابو نجیح اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرمایا کہ بنی اسرائیل نے من سلویٰ کے بجائے سبزی وغیرہ کا مطالبہ کیا تھا. سدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میدان تیہ میں انھیں جو کچھ ملتا تھا اس سے وہ اکتا گئے تھے اور مطالبہ کیا تھا کہ " اے موسیٰ! ہم ایک کھانے پر بس نہیں کر سکتے" ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میدان تیہ میں بنی اسرائیل کو کھانے کے لئے بھی ایک چیز ملتی تھی اور پینے کے لئے بھی ایک ہی چیز ملتی تھی. پینے کے لئے انھیں شہد ملتا تھا جو آسمان سے اترتا تھا اور اسے "من" کہتے تھے اور کھانے کے لئے انھیں ایک پرندہ ملتا تھا جسے "سلویٰ" کہتے تھے. پرندے کا گوشت کھاتے تھے اور شہد پینے کے لئے استعمال کرتے تھے، اس کے سوا روٹی وغیرہ وہاں وہ جانتے ہی نہ تھے، چنانچہ انہوں نے اس کے بجائے سبزی وغیرہ کا مطالبہ کیا. پھر آپ نے "واذ قلتم" سے " اهبطوا مصرا" تک آیت کی تلاوت کی. " فومها" کے معنی کے سلسلے میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں، بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس سے مراد گیہوں اور روٹی ہے. عطار، مجاہد،

لہ زراعت پیشہ قوموں کی طرح مصریوں کی مرغوب غذا زمینی پیداوار، سبز ترکاریاں اور پھل وغیرہ تھے اور یہی چیزیں مصر میں اسرائیلیوں کی بھی غذا بن چکی تھیں. جزیرہ نمائے سینا میں ایک ایسی غذا سے وہ اکتا گئے تھے جو سبزی اور غلہ کی اقسام سے بھی نہیں تھی اور جس میں کسی قسم کا تنوع بھی نہیں ہوتا تھا. (مترجم)

Marfat.com

قتادہ، حسن، ابومالک، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ سے یہی روایت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی روایت ہے، آپ نے فرمایا کہ بنی ہاشم کی زبان میں فوم، گیہوں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض مفسرین نے اس کا معنی "لہسن" بتایا ہے، خود مجاہد رحمۃ اللہ سے ایک روایت میں یہ معنی نقل ہوا ہے۔ ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرمایا کہ "فوم" کے معنے ہیں "لہسن" اور بعض قراءتوں میں تو باصراحت لفظ "ثومہا" (اور اس کا لہسن) آیا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ گیہوں اور روٹی دونوں کے لئے "فوم" اہل عرب کی قدیم لغت ہے چنانچہ بولتے تھے: "فُوْمُوْا لَنَا" یعنی ہمارے لئے روٹی پکا دو۔ کہا جاتا ہے کہ "ثومہا" عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے اگر یہ روایت صحیح ہو تو پھر اسے حروف مبدلہ میں سے مانا جائے گا، اور ایسا کلام عرب میں ہوتا ہے کہ مخرج کے قرب کی وجہ سے بعض اوقات حرف کو بدل دیتے ہیں۔ "قال اتستبدلون الذی ھو ادنیٰ بالذی ھو خیر" یعنی اس پر موسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا تو کیا تم ادنیٰ اور کم قدر و قیمت کی معاش کو بہتر کے مقابلہ میں اختیار کرنا چاہتے ہو۔ "استبدال" (جس سے تستبدلون نکلا ہے) کا یہی مفہوم ہے۔ استبدال کا اصل مفہوم یہ ہے کہ ایک چیز چھوڑ دی جائے اور چھوڑی ہوئی چیز کی جگہ کوئی دوسری چیز لائی جائے۔ "ادنیٰ" کا مطلب ہے معمولی، حقیر، کم تر، بولتے ہیں "ھٰذَا رَجُلٌ دَنِیٌّ" یا "اِنَّهٗ لَیُدْنِیْ فِی الْاُمُوْرِ بِغَیْرِھِمْ" یعنی یہ شخص ہمیشہ ذلیل اور حقیر چیزوں کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ اور اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ من و سلویٰ کے مقابلہ میں ساگ، ککڑی، مسور، پیاز اور لہسن کا مطالبہ ایک عمدہ معاش کے مقابلہ میں معمولی اور گھٹیا درجہ کی معاش کا مطالبہ ہے۔ آیت کی تفسیر کے سلسلے میں قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ، کیا تم خیر اور بھلائی کے مقابلہ میں شر اور اس سے گھٹیا چیز کو اختیار کرنا چاہتے ہو۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "الذی ھو ادنیٰ" یعنی کم تر اور حقیر۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ "ادنیٰ" دنو سے اسم تفضیل ہے جسکے معنے قریب ہونے کے آتے ہیں۔ "اھبطوا مصرًا فان لکم ما سألتم" (کسی شہر میں اتر پڑو وہیں مل جائے گا جو کچھ تم مانگتے ہو) آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ پھر ان کے مطالبہ پر موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی اور ہم نے ان کی دعا قبول کی اور بنی اسرائیل سے کہا کہ کسی شہر میں تم لوگ اتر پڑو۔ اس سے پہلے ہم لکھ آئے ہیں کہ "ھبوط" کا مفہوم اترنا اور کسی جگہ وارد ہونا ہے۔ پوری آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ وقت یاد کرو جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ! ہم ہرگز ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ سو اپنے پروردگار سے آپ ہمارے لئے دعا کر دیجئے ان چیزوں کی جنھیں زمین اگاتی ہے، یعنی ساگ، ککڑی، گیہوں، مسور، پیاز اس پر موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا، کیا تم حقیر اور معمولی زندگی کو بہتر اور اعلیٰ زندگی کے مقابلہ میں اختیار کرنا چاہتے ہو؟ آخر موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے دعا کی کہ اے اللہ! جو یہ چاہتے ہیں انھیں عطا فرما۔ اللہ تعالےٰ نے آپ کی دعا قبول کی اور ان کا مطلوب انھیں عطا فرمایا، اور فرمایا کہ کسی شہر میں اتر جاؤ، جو کچھ تم مانگتے ہو وہیں ملجائے گا۔ "مصرًا" کی قرأت مشہور قاریوں نے تنوین کے ساتھ کی ہے، لیکن بعض حضرات اس پر تنوین نہیں پڑھتے، جن حضرات نے تنوین کے ساتھ (منصرف) پڑھا ہے، ان کے نزدیک "مصر" سے مراد شہر ہے۔ خواہ وہ کوئی بھی ہو، اس مشہور و معروف قرأت کی بنیاد پر آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ (جزیرہ نما کے سینا کے آس پاس) کسی شہر میں اتر جاؤ، اس لئے کہ اسوقت تمہاری زندگی خانہ بدوشوں کی سی ہے اور تم شہری آبادی سے دور ہو۔ جن چیزوں کے تم خواہشمند ہو وہ ریگستانوں اور میدانوں میں نہیں ملے گی۔ بلکہ ان کے لئے تمہیں کسی شہر میں اترنا پڑے گا۔ اس قرأت کی صورت میں اس سے مراد خاص ملک مصر بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جن حضرات نے "مصر" پر تنوین نہیں پڑھی (غیر منصرف سمجھتے ہوئے) ان کے نزدیک متعین طور پر مراد جانا پہچانا ملک "مصر" ہے جسے چھوڑ کے اب بنی اسرائیل اپنے آبائی وطن جا رہے تھے۔ قرأت کے اسی اختلاف کی بنیاد پر مفسرین کا بھی اس لفظ کی تفسیر کے سلسلے میں اختلاف ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ "کسی شہر میں اتر جاؤ، وہیں ملجائے گا وہ جو تم مانگتے ہو" سدی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جب وہ میدان تیہ سے نکل گئے تو "من و سلویٰ" کا آنا بھی بند ہو گیا اور اب وہ ترکاریاں کھانے لگے۔ مجاہد اور ابن زید رحمہما اللہ سے بھی یہی روایت ہے کہ آیت میں "مصر" سے مراد غیر متعین شہر ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اشارہ بیت المقدس کی طرف تھا، جو اللہ تعالےٰ نے ان کے قیام کے لئے مقدر کر دیا تھا، آپ نے دلیل میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پڑھا "داخل ہو جاؤ سرزمین

Marfat.com

مقدس (شام بیت المقدس) میں جو اللہ تعالےٰ نے تمہارے لئے مقدر کر دیا ہے"۔ لیکن ابو العالیہ اور ربیع رحمہما اللہ سے روایت
ہے کہ مراد فرعون کا ملک "مصر" ہے (جس سے وہ نکل کر آئے تھے) جن مفسرین نے غیر متعین شہر اس سے مراد لیا ہے، اُن کا کہنا یہ ہے کہ
اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کے بعد ملک شام کو ان کے قیام کے لئے متعین کر دیا تھا، لیکن راستے میں جب موسیٰ علیہ السلام نے انسے
کہا کہ "اے قوم! سرزمین مقدس میں داخل ہو جاؤ جو اللہ تعالےٰ نے تمہارے لئے مقدر کر دیا ہے اور پشت نہ پھیرو کہ اگر تم نے
پشت پھیری تو تم بہت نقصان میں رہو گے، تو ان کی قوم کے لوگوں نے کہا، اے موسیٰ! اس میں تو ظالم و جابر لوگ رہتے ہیں، اور جب تک
وہ اس میں ہیں ہم ہرگز وہاں نہ جائیں گے، پس آپ اور آپ کے رب جائیں اور اُن سے جنگ کریں، ہم تو یہیں بیٹھے ہوئے ہیں"۔ اس
طرح جب بنی اسرائیل نے ظالموں سے لڑنے سے انکار کیا تو اللہ تعالےٰ نے انھیں میدان تیہ میں مبتلا کر دیا اور جن افراد نے یہ الفاظ
کہے تھے ان کے سرزمین مقدس میں داخلہ کی تمام صورتیں ختم کر دیں، پھر جب یہ تمام اسی ریگستان میں مر گئے تو چالیس سال کے بعد ان کی
اولاد کیلئے شام میں داخل ہونے کی صورت پیدا کی، ان لوگوں نے ہی بیت المقدس میں سکونت اختیار کی اور شام کا ظالم حکمران، یوشع
بن نون علیہ السلام کی قیادت میں انھیں کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ بیت المقدس میں داخلہ موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد عمل میں آیا ہے۔ تو
اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کے متعلق تمہیں یہی اطلاع دی ہے کہ بیت المقدس کو اُن کے قیام کے لئے اُس نے مقدر کر دیا تھا، یہ
کہیں نہیں بتایا ہے کہ مصر سے نکلنے کے بعد پھر دوبارہ انہیں وہاں واپس بھیجا تھا۔ اس لئے یہ ممکن نہیں کہ "مصر" بغیر تنوین کے غیر منصرف پڑھا
جائے اور اس سے خاص ملک مصر مراد لیا جائے۔ لیکن جو مفسرین اس سے خاص ملک مصر مراد لیتے ہیں وہ دلیل میں اس آیت کو
پیش کرتے ہیں "فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ" (پھر ہم نے انھیں
نکال باہر کیا باغوں اور چشموں اور خزانوں اور عمدہ مکانات سے، یوں ہی ہوا اور ہم نے اُن کے بعد اس کا مالک بنی اسرائیل کو
بنا دیا) اور ایک موقع پر ارشاد ہے "كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ كَذٰلِكَ وَ
اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ" (وہ لوگ کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیتیاں اور عمدہ مکانات اور آرام کے سامان جن میں رہا کرتے تھے چھوڑ
گئے (یہ قصہ) اسی طرح واقع ہوا اور ہم نے ان چیزوں کا مالک ایک دوسری قوم کو بنا دیا)
انہوں نے کہا کہ اللہ تعالےٰ نے آیت میں بتایا کہ اس نے ملک مصر کو ان کے لئے مقدر کر دیا تھا اور انھیں وارث بنا دیا تھا، اس لئے یہ کیسے
ممکن ہے کہ اسے پا کر پھر اس کی نعمتوں سے وہ منتفع نہیں ہوئے ہوں گے اور اس سے منتفع ہونے اور فائدہ اٹھانے کی یہی صورت
ہو سکتی ہے کہ وہ مصر دوبارہ واپس گئے ہوں، اگر وہ مصر نہیں گئے ہوں گے تو اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کی بھی کوئی صورت
متصور نہیں ہو سکتی لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ملک مصر ان کی ملکیت میں اللہ تعالےٰ نے دیدیا تھا اور انھیں اس کا وارث بنا دیا
تھا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ پھر دوبارہ وہاں واپس بھی گئے ہوں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ابی بن کعب اور عبد اللہ
بن مسعود رضی اللہ عنہما کی قراءت میں بھی "مصر" بغیر تنوین کے (غیر منصرف) پڑھا گیا ہے اس سے بھی متعین اور واضح طور پر سمجھا جا سکتا کہ
مراد ملک مصر ہی ہے، ہماری رائے میں نہ تو کتاب اللہ سے یہ ثابت ہوتا کہ ان دونوں تفسیروں سے کونسی تفسیر صحیح اور درست
ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں اس کی تعیین کے لئے کوئی قطعی حکم ہے۔ لیکن بہرحال مفسرین کا اختلاف
ہے اور ہمارے نزدیک زیادہ مناسب اور زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ ان کی قوم
زمین سے اُگنے والی جن سبزیوں کا مطالبہ کر رہی ہے وہ اسے دی جائیں، جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے۔ اس وقت وہ لوگ
جزیرہ نما سینا میں خانہ بدوشوں کی طرح پھرتے رہتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول کی اور انھیں حکم دیا کہ اپنی قوم کے
افراد کے ساتھ مستقل سکونت کے لئے کسی ایسے شہر میں اتر جائیں جہاں وہ زمینی پیداوار ہوتی ہوں جن کا انہوں نے مطالبہ
کیا تھا۔ اس لئے کہ جن چیزوں کا انہوں نے مطالبہ کیا تھا وہ شہروں اور آبادیوں میں ہی مل سکتی تھیں، اور پھر جب وہ شہری آبادی

Marfat.com

ہیں گئے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں ان کی مطلوبہ چیزیں دیں۔ ممکن ہے کہ وہ شہر (جہاں وہ اترے تھے) مشہور ملک مصر رہا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ شام ہو البتہ قرأت میرے نزدیک "مصر" تنوین کے ساتھ (غیر منصرف) ہی ہے اس کے سوا کوئی دوسری قرأت میرے نزدیک جائز نہیں۔ اس لئے کہ مسلمانوں کے تمام مصاحف اسی کے مطابق ہیں اور تمام قاریوں کا بھی اس پر اتفاق ہے۔ جن لوگوں نے تنوین کے بغیر "مصر" (غیر منصرف) پڑھا ہے، وہ اس حیثیت کے قاری نہیں ہیں کہ اسے مشہور و معروف قرارت کے خلاف دلیل بنایا جاسکے۔ (جن صحابہ سے اس کے حق میں روایت منقول ہے وہ روایت ضعیف ہے)

ذلّت و محتاجی کا عذاب

"وضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ" یعنی ذلت و محتاجی ان کے لئے لازم کردی گئی، ان پر جمادی گئی۔ بولتے ہیں۔ "ضَرَبَ الْاِمَامُ الْجِزْیَۃَ عَلٰی اَھْلِ الذِّمَّۃِ" یعنی امام نے غیر مسلم رعایا کے لئے جزیہ متعین کردیا اور ان پر لازم کردیا "ضَرَبَ الرَّجُلُ عَلٰی عَبْدِہِ الْخَرَاجَ" مالک نے اپنے غلام کا خراج طے کردیا اس پر لازم کردیا "ذِلَّۃ" "فِعْلَۃٌ" کے وزن پر "ذَلَّ فُلَانٌ، یَذِلُّ، ذُلًّا وَذِلَّۃً" سے نکلا ہے، جیسے "صِغْرَۃٌ" "صَغُرَ" سے اور "فَعُلَۃٌ" "فَعُلَ" سے نکلا ہے "ذِلَّۃ" سے مراد وہ ذلت ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں پر لازم کیا ہے کہ اپنی حدود سلطنت میں کفار کو اس وقت تک ان کے جان و مال کے حفاظت کی کوئی گارنٹی نہ دیں جب تک وہ ایک متعین مقدار میں حکومت کو ٹیکس دینا منظور کرلیں اور جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کا کفر کرتے رہیں ان سے وہ ٹیکس لیا جاتا رہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّھُمْ صَاغِرُوْنَ" (اہل کتاب میں سے ان سے لڑو جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ روز آخرت پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جنھیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے اور نہ سچے دین کو قبول کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں رعیت ہو کر اور اپنی پستی کا احساس کرکے)

حسن اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہما سے آیت کی تفسیر میں یہی روایت ہے کہ وہ ذلیل ہو کر جزیہ دیا کریں گے۔ "اَلْمَسْکَنَۃُ" تسکین سے مصدر میمی ہے۔ بولتے ہیں "اَسْکَنُ مِنْ فُلَانٍ" فلاں سے بھی زیادہ مسکین۔ مسکین طبع شخص کے لئے بولتے ہیں "لَقَدْ تَمَسْکَنَ مَسْکَنَۃً" بعض اہل عرب "تَمَسْکَنَ تَمَسْکُنًا" بھی بولتے ہیں۔ یہاں "مسکنۃ" سے مراد فاقہ اور محتاجی کی مسکنت ہے، یعنی احتیاج اور ضرورت کی وجہ سے ذلت۔ ابوالعالیہ اور سدی رحمۃ اللہ علیہما سے مسکنۃ کی تفسیر فقر و فاقہ ہی نقل ہوئی ہے ابن وھب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا آیت یہودیوں کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ ابن وھب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ میں نے پوچھا کیا مراد مصر کے قبطیوں کے زمانہ کے یہودی ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، خدا گواہ ہے، خاص وہ مراد نہیں ہیں، مراد عام یہودی ہیں، بنی اسرائیل! ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ ان کی عزت کو ذلت سے۔ نعمتوں کو خسران سے بدل دے گا اور ان سے اگر یہ راضی اور خوش تھا تو اب ان پر غصہ اور غضبناک ہے رب بدلہ ہے، اس کا کہ انہوں نے اللہ کی آیات کا کفر کیا، بلاحق کے اللہ کے انبیاء اور رسولوں کو قتل کیا اور ان کی نافرمانی اور مخالفت کرتے رہے۔ "وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ" (اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہوگئے) "بَاءُوْا" یعنی لوٹے، واپس ہوئے "باء" جب بھی استعمال ہوتا ہے تو خیر یا شر میں سے کوئی نہ کوئی چیز اس کے ساتھ ضرور استعمال ہوتی ہے اس سے بولتے ہیں "بَاءَ فُلَانٌ بِذَنْبِہٖ" (فلاں اپنے گناہ کے ساتھ اور اسے اپنے سر لئے ہوئے لوٹا) اللہ تعالیٰ کے ارشاد "انی ارید ان تبوء باثمی و اثمک" (میں تو یہی چاہتا ہوں کہ تو میرے (قتل کا) گناہ اور اپنا پچھلا گناہ دونوں اپنے سر رکھ لے) میں بھی یہی معنی مراد لیا گیا ہے، یعنی میرے اور اپنے دونوں کے گناہ کا بار اٹھائے ہوئے واپس ہو لہذا "باء و بغضب من اللہ" کا مفہوم یہ ہوگا کہ "جب وہ واپس ہوئے تو اللہ کے غضب کو اٹھائے ہوئے تھے، انپر اللہ کا غضب پڑ چکا تھا" ربیع رحمۃ اللہ علیہ نے بھی آیت کا مطلب یہی بیان کیا ہے کہ پس ان پر اللہ کا غضب پڑ گیا، ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہوگئے" بندے پر اللہ کے غضب کا مفہوم ہم پہلے

Marfat.com

بیان کر چکے ہیں، یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ "ذالك بانہم کانوا یکفرون بآیات اللہ ویقتلون النبین بغیر الحق" (یہ سب اس لئے ہوا کہ وہ اللہ کی نشانیوں سے انکار کرتے رہتے تھے اور انبیاء کو ناحق قتل کر ڈالتے تھے) "ذالك" سے ارشارہ ذلت ومسکنت کے انپر جمانے اور ان کے اللہ کے غضب کے مستحق ہونے کی طرف ہے۔ "بانہم کانوا یکفرون" کا مفہوم یہ ہے کہ "اس وجہ سے کہ وہ کفر کرتے تھے"، اللہ تعالےٰ نے یہاں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے انپر اپنا غضب اور ذلت ومحتاجی اس لئے نازل کی ہے کہ وہ اللہ کی نشانیوں کا کفر کرتے رہتے تھے اور ناحق انبیاء کو قتل کر ڈالتے تھے، یعنی ہمارا عذاب، یہ غضب اور ان کی ذلت ومحتاجی، سب کچھ ان کا کفر اور انبیاء کو ناحق قتل کرنے کا بدلہ تھا۔ "ویقتلون النبین بغیر الحق" یعنی اللہ کے ان پیغمبروں کو وہ ناحق قتل کر ڈالتے تھے جنھیں اللہ اپنی طرف سے احکام اور پیغامات دے کر بھیجتا تھا۔ "انبیاء" جمع ہے اس کا واحد "نبی" ہے۔ اس کے اصل میں ہمزہ بھی ہے، "اَنْبَاَءَ عَنِ اللّٰہِ" (اللہ کی طرف سے خبردی) سے نکلا ہے۔ ویسے اس کا اسم "مُنْبِئٌ" ہے "مُفْعِلٌ" کے وزن پر، لیکن اسے فعیل کے وزن پر "نبی" بنالیا گیا ہے جیسے سمیع مسمع سے اور بصیر مبصر سے بنالیا گیا ہے، اس طرح کلام عرب میں اکثر ہوتا ہے۔ "نبی" میں ہمزہ کے بجائے یا رکھدی گئی ہے اور اس کی جمع "انبیاء" لاتے ہیں۔ بعض اہل عرب سے اس کی جمع "نُبَآٰءُ" بھی سنی گئی ہے، یہ لوگ نبئ کو ہمزہ کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اس لئے نبآٰء جمع لاتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں عباس بن مرداس کا ایک شعر ہے۔

یَاخَاتَمَ النُّبَآءِ اِنَّكَ مُرْسَلٌ — بِالْحَقِّ خَیْرُ ھُدَی الْاِلٰہِ ھُدَاکَا۔

(اے انبیاء کے خاتم صلی اللہ علیہ وسلم: بلاشبہ آپ حق کے ساتھ بھیجے گئے ہیں آپ کی ہدایت اللہ کی طرف سے سب سے اچھی ہدایت ہے) یہاں بھی اس وزن پر جمع اسی بنیاد پر ہے کہ اس کا واحد شاعر کے نزدیک ہمزہ کے ساتھ نبئ ہے۔ بعض حضرات نے اسے "نبی" اور "نبوۃ" سے ماخوذ مانا ہے، ہمزہ کے بغیر، نجوۃ بمعنی بلند جگہ کی طرح نبی کا اصل مفہوم یہ حضرات "راستہ" بتاتے ہیں۔ قطامی کا ایک شعر ہے:

"لَمَّا وَرَدْتُ نَبِیًّا وَاسْتَتَبَّ لَنَا۔ مُسْتَحْقِرٌ لِخُطُوْطِ النَّسْجِ مُنْسَحِلٌ۔"

(جب میں راستہ پر اترا اور وہ راستہ ہمارے لئے کھل گیا تو اس کے تمام نشیب وفراز میری نظر میں حقیر ہوگئے اور میں انھیں خاطر میں نہ لایا)

اس شعر میں بھی "نبیا" کا معنی راستہ لیا گیا ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے نبی کو نبی اس لئے کہیں گے کہ وہ ہمیں راستہ دکھاتے ہیں اور ہمارے سامنے اسے صاف اور واضح کردیتے ہیں۔ "یقتلون النبین بغیر الحق" کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی طرف سے انھیں کوئی اجازت نہیں اور اس کے بغیر وہ انبیاء کو محض اس لئے قتل کرتے ہیں کہ وہ ان کے منکر ہیں اور اُن کی نبوت کو تسلیم نہیں کرتے۔ "ذالك بما عصوا وکانوا یعتدون" (یہ سب اس لئے ہوا کہ وہ نافرانی کرتے اور حد سے بڑھ بڑھ جاتے تھے) آیت کا مطلب اس طرح ہوگا کہ "اُن پر ذلت ومحتاجی جمادی گئی اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہوگئے، کیونکہ وہ اللہ کا کفر کیا کرتے تھے اور انبیاء کو ناحق قتل کر ڈالتے تھے اور اُن کے اس عمل کی وجہ یہ تھی کہ وہ نافرمانی کرتے اور حد سے بڑھ بڑھ جاتے تھے۔ "اعتداء" کہتے ہیں حد سے بڑھ جانے کو، کہ جو حد اللہ تعالےٰ نے بندوں کے لئے مقرر کردی ہے اس سے وہ تجاوز کرجائیں ہر حد سے بڑھ جانے والے شخص کے لئے "تعدی" کا لفظ استعمال ہوسکتا ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے جو انہیں سزادی اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہمارے حکم کی خلاف ورزی کی اور جو حد ہم نے ان کے لئے متعین کردی تھی اس سے بڑھ کر وہ کام کئے جن سے ہم نے انھیں روکا تھا۔

Marfat.com

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ

یہ تحقیقی بات ہے کہ مسلمان اور یہودی اور نصاری اور فرقہ صابئین (ان سب میں) جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ

بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ

تعالیٰ (کی ذات و صفات) پر اور روز قیامت پر اور کارگزاری اچھی کرے ایسوں کے لئے ان کا حق الخدمت بھی ہے ان کے پروردگار کے پاس اور وہاں جاکر کسی طرح کا اندیشہ بھی

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○

نہیں ان پر اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

"ان الذین آمنوا والذین ھادوا والنصاریٰ والصابئین" (بیشک جو لوگ ایمان لاچکے ہیں، اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی) "ان الذین آمنوا" سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان امور میں تصدیق کی جنھیں لیکر آپ مبعوث ہوئے تھے۔ "الذین ھادوا" سے مراد یہودی ہیں۔ "ھادوا" کا مفہوم ہے کہ "جنھوں نے توبہ کی" ھَادَ الْقَوْمُ ھَوْدًا وَھَادَۃً سے نکلا ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہود ان کا نام اس لئے پڑا کہ انہوں نے ایک موقعہ پر کہا تھا۔ "اِنَّا ھُدْنَا اِلَیْکَ" (ہم تو تیرے ہی آگے جھک گئے ہیں) ابن جریج رضی اللہ عنہ سے یہی روایت ہے کہ یہود نے ایک موقعہ پر کہا تھا "انا ھدنا الیک" اس لئے ان کا نام یہود پڑا۔ "والنصاریٰ" نصاریٰ جمع ہے اس کا واحد نَصْرَان ہے جیسے سکاریٰ کا واحد سکران نشاویٰ کا واحد نشوان ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جو صفت بھی واحد میں "فَعْلَان" کے وزن پر آتی ہے تو اس کی جمع فَعَالیٰ کے وزن پر آتی ہے۔ لیکن عام طور سے کلام عرب میں نصاریٰ کے واحد کے لئے نصرانی کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کا واحد "نصران" بھی عربوں کے بہت سے اشعار میں استعمال ہوا ہے نصاریٰ نام کی وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے "ناصرہ" نامی بستی میں قیام کیا تھا۔ یہ روایت بھی ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے ارشاد "مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ" (کون میرا مددگار ہوتا ہے اللہ کے واسطے؟) کی وجہ سے ان کے متبعین کا نام نصاریٰ پڑا ہے۔ دوسرے علماء کا خیال ہے کہ "ناصرہ" بستی میں عیسیٰ علیہ السلام رہتے تھے اور اس لئے آپ کے متبعین کا نام نصاریٰ پڑا۔ آپ کے صحابہ کو "ناصریین" کہتے تھے اور عیسیٰ علیہ السلام کو "ناصری" کہا جاتا تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی روایت ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع کرنے والے "ناصرہ" نامی ایک بستی میں رہتے تھے۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام بھی وہیں تشریف لائے۔ نصاریٰ نے اپنا یہ نام خود رکھ لیا۔ انھیں اس کا حکم نہیں ہوا تھا۔

"والصابئین" "الصابئون" صابی کی جمع ہے، اپنے دین کو چھوڑ کر کوئی نیا دین اختیار کر لینے والے کو کہتے ہیں، اسلام چھوڑ کر اگر کوئی مرتد ہو جائے تو اسے بھی صابی کہتے ہیں۔ اہل عرب ہر اس شخص کو صابی کہتے تھے جو اپنا پرانا دین چھوڑ کر کوئی دوسرا دین اختیار کر لیتا تھا۔ "صَبَا فُلَانٌ" (فلاں بے دین ہو گیا) اسی سے کہتے ہیں صباء اس کا مصدر ہے۔ صَبَأَتِ النُّجُوْمُ یعنی ستارے نکل آئے۔ "صَبَا عَلَیْنَا فُلَانٌ مَوْضِعَ کَذَا" یعنی فلاں شخص فلاں جگہ اچانک ہمارے سامنے آیا۔ مفسرین کا اختلاف ہے کہ اس لفظ "الصّابئین" سے قرآن مجید میں کیا مراد لیا گیا ہے؟ بعض حضرات نے فرمایا کہ اس میں ہر وہ شخص آجاتا ہے جس نے کسی بھی ایسے دین سے نکل کر جسکو پہلے سے وہ مانتا تھا دوسرا کوئی دین اختیار کر لیا ہو۔ ان کا کہنا ہے کہ اس لفظ سے آیت میں ایک ایسی جماعت مراد لی گئی ہے جسکا کوئی دین نہیں تھا۔ چنانچہ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ "الصابئین" وہ جماعت ہے جو نہ یہودی ہے نہ نصرانی اور نہ اس کا کوئی دین ہے۔ ایک روایت میں مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے کہ صابی یہودیوں اور مجوسیوں کے بیچ کا ایک فرقہ تھا ان کا کوئی

Marfat.com

دین نہ تھا. ہمارے لئے ان کا ذبیحہ کھانا اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے. حسن اور ابو نجیح رحمۃ اللہ علیہما سے بھی یہی روایت ہے۔

ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ میں نے عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا، "صابئین" کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ یہ عراق کا ایک قبیلہ ہے اور نہ مجوسی ہے، نہ یہودی اور نہ نصرانی؟ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہم نے بھی یہ سنا ہے اور مشرکین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی فرمایا تھا کہ "قَدْ صَبَا" (آپ بے دین ہو گئے نعوذ باللہ) ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے "الصابئین" کی تفسیر میں روایت ہے کہ یہ طبقہ جزیرۂ موصل میں رہتا تھا اور اس کا اپنا ایک الگ دین تھا. یہ لوگ لا الہ الا اللہ کہتے تھے، لیکن نہ کوئی عمل (عبادت) کرتے تھے، لا الہ الا اللہ کے سوا ان کے پاس کوئی کتاب آسمانی بھی نہیں تھی، اور نہ ان کا کوئی نبی تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی یہ لوگ ایمان نہیں لائے تھے. ان کے انھیں خاص عقیدوں کی طرف منسوب کر کے مشرکین عرب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو بھی "صابی" کہتے تھے. ان کا مقصد یہ تھا کہ یہ بھی انھیں جیسے ہیں. بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ "صابئین" ایک ایسی جماعت ہے جو فرشتوں کی پوجا کرتی ہے اور قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتی ہے. حسن رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ زیاد (گورنر عراق) نے مجھ سے کہا کہ صابئین قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور پانچ وقت نماز پڑھتے ہیں. بیان کیا کہ زیاد نے اس ارادہ کا اظہار کیا کہ جزیہ (جو اسلامی حکومت میں غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے) اُن سے نہ لینا چاہیئے. بیان کیا کہ پھر بعد میں اسے بتایا گیا کہ وہ تو فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں. قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ صابئین ایک ایسی قوم ہے جو فرشتوں کی عبادت کرتی ہے. قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتی ہے اور زبور کی تلاوت کرتی ہے. ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے صابئین اہل کتاب کا ایک فرقہ ہے جو زبور کو مانتا ہے اور قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتا ہے. ابو جعفر رازی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ صابئین ایک ایسی قوم ہے جو فرشتوں کو پوجتی ہے، زبور کی تلاوت کرتی ہے اور قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتی ہے. بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ بھی اہل کتاب میں سے ہیں. چنانچہ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے "صابئین" کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ بھی اہل کتاب کی ایک جماعت ہے[1]۔ "ممن آمن باللہ والیوم الآخر وعمل صالحا فلھم اجرھم عند ربھم" یعنی جس نے اللہ کی تصدیق کی، موت کے بعد قیامت کے دن دوبارہ جی اُٹھنے کا اقرار کیا اور نیک عمل کیا یعنی اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کی تو (جو کوئی بھی ایسا کرے گا) ان سب کے لئے ان کے پروردگار کے پاس ان کا اجر ہے، یعنی جو نیک اور صالح اعمال انھوں نے کئے ہوں گے ان کا ثواب ان کے پروردگار کے یہاں سے انھیں ملے گا۔ "ان الذین آمنوا والذین ھادوا والنصٰری والصابئین" سے جو جملہ شروع ہوا تھا، اسے "من آمن باللہ والیوم الآخر وعمل صالحا فلھم اجرھم عند ربھم" پر وہ تمام ہوا ہے. آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ان سب فرقوں میں سے (جنکا ذکر اوپر ہوا) جو بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے گا اسے اس کا اجر اس کے پروردگار کے یہاں سے ملے گا۔ "من آمن" کے بعد ان فرقوں کا ذکر دوبارہ اس لئے نہیں کیا کہ پہلے ایک مرتبہ ان کا ذکر آچکا ہے، یعنی جو لوگ ایمان لا چکے ہیں، اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی تو جو بھی ان میں سے

---

[1] عرب کے شمال و مشرق میں شام و عراق کی سرحد پر "صابئین" (Sabians) نام کا ایک مذہبی فرقہ تھا. اس کے مذہبی معتقدات میں بہت سی رائیں ہیں اور بہت سے اہل تحقیق کی روایت ہے کہ یہ لوگ بھی اہل کتاب میں سے تھے جیسا کہ حسن، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ سے ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نقل کیا ہے. امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جو خود بھی عراقی تھے اور اس لئے صابیوں سے براہ راست واقفیت کا موقع رکھتے تھے، ان کا یہ فتویٰ ہے کہ انکے ہاتھ کا ذبیحہ حلال ہے اور ان کے یہاں کی عورتوں سے نکاح بھی جائز ہے. یعنی آپ نے بھی انھیں اہل کتاب میں شمار کیا ہے (مترجم)

Marfat.com

اللہ پر اور آخرت پر ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے، ان سب کے لئے ان کے پروردگار کے پاس ان کا اجر ہے۔ اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ "الذین آمنوا" (جو لوگ ایمان لا چکے ہیں) کا پہلے ہی ذکر ہو چکا ہے۔ پھر یہودیوں اور نصرانیوں کے ساتھ ان سے بھی کہا جاتا ہے کہ، "من آمن باللہ" (ان میں سے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے) تو جو پہلے ہی سے مومن ہے اس کے دوبارہ ایمان لانے کا کیا مفہوم ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہودیوں اور نصرانیوں سے جس طرح آیت میں کہا گیا ہے کہ وہ اپنا دین چھوڑ کر ایمان لائیں، وہ مفہوم مومن کے سلسلے میں مراد نہیں لیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت میں "ان الذین آمنوا" سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جو پہلے سے عیسٰی السلام اور آپ کے دین پر ایمان رکھتے تھے، پھر انھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا اور آپ پر بھی ایمان لائے اور آپ کی تصدیق کی۔ تو آیت میں ان لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے جو پہلے سے عیسٰی علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت پر ایمان لائے، لیکن میرا خیال ہے کہ آیت میں مومن کے ایمان کا مفہوم ایمان پر ثابت قدمی اور اسے تبدیل نہ کرنا ہے۔ رہا یہود نصاریٰ اور صابیوں کے ایمان کا سوال تو اُن سے مطالبہ اس کا ہے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے شریعت کی تصدیق کریں پس جو شخص بھی ان میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی شریعت اور آخرت کے دن پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا، پھر اس سے پھرے گا نہیں اور نہ اسمیں کوئی تبدیلی کریگا۔ یہانتک کہ اسی حال میں اسکی موت ہو جائیگی تو اسکے عمل کا ثواب اور اسکا اجر اس کے پروردگار کے پاس سے اسے ملے گا، "من آمن" سے عمل صالحا تک فعل وغیرہ واحد کے صیغہ کے ساتھ استعمال ہوا، لیکن اسی جملہ میں انھیں کے لئے جن کے لئے اب تک واحد کی ضمیر استعمال ہو رہی تھی "لہم اجرھم عند ربہم" میں جمع کی ضمیر استعمال کی کیونکہ اگرچہ لفظ "من" کے بعد فعل "آمن" واحد کے صیغہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے، لیکن خود من واحد، جمع، مذکر اور مونث سب کے لئے استعمال ہو سکتا ہے۔ اہل عرب ایسے مواقع پر واحد اور جمع دونوں صیغے استعمال کر لیتے ہیں۔

"ولا خوف علیہم ولا ہم یحزنون" (نہ کوئی اندیشہ ان کے لئے ہے اور نہ وہ کوئی غم کریں گے) یعنی جو اعمال انھوں نے اپنی زندگی میں کئے ہیں ان کی وجہ سے قیامت کی ہولناک ساعت میں ان کے لئے کوئی اندیشہ و فکر نہ ہوگا اور نہ انھیں ان چیزوں کا کوئی غم ہوگا جو انھوں نے دنیا میں آرام و راحت کی چھوڑ دی ہیں۔ کیونکہ وہ اس ثواب اور اس جنت کا خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیں گے جو اللہ تعالٰے نے ان کے لئے تیار کر رکھی ہے۔ جن مفسرین نے "من آمن باللہ" تا "فلہم اجرھم عند ربہم" سے مومنین اہل کتاب مراد لئے ہیں ان میں سدی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ آپ سے آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ آیت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور آپ جیسے دوسرے صحابہ کے بارے میں (جو اسلام سے پہلے اہل کتاب میں تھے) نازل ہوئی ہے۔ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ملک سابور کے فوجی کمانڈروں میں سے تھے۔ بادشاہ کے لڑکے سے آپ کی بڑی گہری دوستی تھی، دونوں ہر وقت ساتھ رہتے تھے اور کبھی جدا نہ ہوتے تھے شکار کیلئے بھی ساتھ ہی جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شکار کی تلاش میں تھے کہ انھیں ایک جھونپڑا دکھائی دیا۔ دونوں وہاں پہنچے، دیکھا کہ اس میں ایک شخص ہے اس کے سامنے ایک کتاب ہے اور وہ رو رہا ہے۔ انہوں نے اس شخص سے پوچھا، یہ کیا چیز ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ جو شخص اس کتاب کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے وہ تمہاری طرح گھوڑے پر سوار ہو کر نہیں سوال کرتا، اگر تم اس کتاب کا علم حاصل کرنا چاہتے ہو تو پہلے نیچے اتر آؤ تاکہ میں تمہیں تعلیم دوں۔ دونوں سواری سے اُتر آئے۔ اب انہوں نے بتایا کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے، اللہ نے اس میں اپنی طاعت کا حکم دیا ہے اور نافرمانی سے منع کیا ہے، اس میں لکھا ہوا ہے کہ ہم زنا نہ کریں۔ چوری نہ کریں۔ اور لوگوں کا مال غلط اور ناجائز طریقوں سے نہ لیں، انھوں نے ان دونوں ساتھیوں کے سامنے اس کے احکام و نواہی تفصیل سے بیان کئے۔ اور وہ کتاب انجیل تھی جسے اللہ تعالٰے نے عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل کیا تھا۔ ان دونوں ساتھیوں کے دل میں بات بیٹھ گئی اور یہ ان کے پیروکار بن گئے اور اسلام لائے۔ ان بزرگ نے دونوں ساتھیوں سے یہ بھی کہا کہ تمہاری قوم کا ذبیحہ تم پر حرام ہے۔ دونوں ان کے پاس آنے جانے لگے اور اللہ کی

Marfat.com

کتاب کا علم سیکھتے رہے۔ ایک مرتبہ بادشاہ کی عید کا دن تھا۔ اس دن اس نے کھانا تیار کروایا اور عوام و اشراف کو جمع کیا۔ شہزادہ کے پاس بھی آدمی بھیجا اور کہلوایا کہ کھانا لوگوں کے ساتھ کھائیے۔ لیکن شہزادہ نے انکار کیا اور کہا کہ مجھے فرصت نہیں، آپ اپنے آدمیوں کے ساتھ تناول فرمائیں۔ لیکن جب بادشاہ نے بار بار آدمی بھیجے تو شہزادہ نے بتایا کہ وہ ان کا کھانا نہیں کھاتا۔ آخر بادشاہ نے آدمی بھیجکر شہزادہ کو بلوایا اور دریافت کیا کہ آخر قصہ کیا ہے؟ شہزادہ نے جواب دیا کہ ہم تمہارا ذبیحہ نہیں کھاتے، کیوں کہ تم لوگ کافر ہو اور تمہارا ذبیحہ جائز نہیں ہے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ یہ تم سے کس نے کہا؟ شہزادہ نے جواب دیا کہ مجھے فلاں راہب نے بتایا ہے۔ بادشاہ نے راہب کو بلوایا اور پوچھا کہ یہ میرا بیٹا کس طرح کی باتیں کر رہا ہے؟ راہب نے جواب دیا کہ سچ کہہ رہا ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ اگر خون بہانا ہمارے یہاں بہت بڑا پاپ نہ ہوتا تو میں تمہیں قتل کر ڈالتا، اب تم ہمارے ملک سے نکل جاؤ۔ سلمان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ان کی اس جلا وطنی پر ہم رونے لگے۔ لیکن ان راہب نے کہا کہ اگر واقعی تم سچے ہو تو میں موصل میں اپنے ان ساٹھ آدمیوں کے ساتھ قیام کروں گا جنھوں نے مجھ سے بیعت کی ہے۔ ہم وہاں اللہ کی عبادت (آزادی کے ساتھ) کریں گے، تم لوگ بھی وہیں آجانا۔ چنانچہ راہب اس ملک سے نکل گئے۔ سلمان رضی اللہ عنہ اور شہزادہ ابھی وہیں تھے (اب سلمان رضی اللہ عنہ شہزادہ سے راہب کے پاس چلنے کے لئے کہتے تو شہزادہ صرف ہاں کرکے رہ جاتا۔ اس عرصہ میں سفر کی تیاری کے لئے شہزادہ اپنا مال و اسباب بیچتا رہا، لیکن جب بہت تاخیر ہوگئی تو سلمان رضی اللہ عنہ تنہا نکل پڑے۔ آخر آپ راہب کے پاس پہنچ گئے۔ اور وہیں قیام کیا۔ سلمان رضی اللہ عنہ اس راہب کے ساتھ عبادت و ریاضت کرنے لگے۔ اتنی ریاضت کرتے کہ تھک جاتے۔ اس لئے راہب نے ان سے کہا کہ تم ابھی نو عمر ہو اور عبادت و ریاضت اتنی زیادہ کرتے ہو جس کی تم میں طاقت نہیں، مجھے ڈر ہے کہ اس کثرت عبادت کے نتیجہ میں کہیں تم عاجز نہ ہو جاؤ، اپنے اوپر رحم کرو، عبادت میں کمی کرو۔ سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ مجھے صرف اتنا بتا دیجئے کہ عبادت میں وہ طریقہ افضل ہے جس کا آپ مجھے مشورہ دے رہے ہیں یا وہ افضل ہے جو میں کرتا ہوں؟ راہب نے بتایا ہے کہ افضل تو وہی ہے جو تم کرتے ہو۔ اس پر آپ نے کہا کہ پھر مجھے عبادت و ریاضت اپنے طریقہ پر کرنے دیجئے۔ اس کے بعد راہب نے آپ کو بلایا اور آپ سے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ یہ بیعت (عہد) جو تم نے مجھ سے کیا ہے، میری ہے اور میں ہی اس کا تمام دوسرے لوگوں سے زیادہ مستحق ہوں لیکن اب میں ضعیف ہو گیا ہوں اور اس بیعت کے مطابق جو عبادتیں مجھے کرنی چاہئے تھیں انہیں میں ادا نہیں کر سکتا، اس لئے میرا ارادہ ہے کہ اس بیعت کے بجائے ایک دوسری بیعت کروں جس کی عبادت و ریاضت اس کے مقابلے میں خفیف اور ہلکی ہو۔ اس لئے اگر تم چاہتے ہو کہ یہیں قیام کرو (اور پہلی بیعت کے مطابق ریاضت کرو) تو تم ایسا کر سکتے ہو، لیکن اگر تم میرے ساتھ چلنا چاہو تو اس کا بھی تمہیں اختیار ہے۔ سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان دونوں بیعتوں میں افضل کون ہے؟ راہب نے بتایا کہ یہی جس پر تم اب ہو۔ سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پھر میں اسی پر قائم رہوں گا۔ چنانچہ آپ اسی پر قائم رہے۔ وہ راہب بیعت کے عالم کو سلمان رضی اللہ کے متعلق وصیت کر گئے۔ اس کے بعد آپ انھیں لوگوں کے ساتھ عبادت و ریاضت کرتے رہے۔ پھر ان شیخ عالم کا ارادہ بیت المقدس جانے کا ہوا۔ انہوں نے سلمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اگر تم بھی میرے ساتھ چلنا چاہو تو چل سکتے ہو، اور اگر یہیں ٹھہرنا چاہو تو اس کا بھی تمہیں اختیار ہے۔ سلمان رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ ان دونوں میں افضل کیا ہے۔ آپ کے ساتھ چلنا یا یہیں ٹھہرنا؟ انہوں نے بتایا کہ میرے ساتھ چلنا افضل ہے۔ آپ نے کہا کہ پھر میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔ چنانچہ آپ ان کے ساتھ بیت المقدس گئے۔ راستے میں ان کا گذر ایک اپاہج شخص سے ہوا جو راستے پر اوندھا پڑا تھا۔ جب اس نے ان دونوں کو دیکھا تو آواز دی کہ اے راہبوں کے سردار! مجھ پر رحم کیجئے، اللہ آپ پر رحم کرے گا۔ لیکن انہوں نے اس سے کوئی بات نہیں کی اور نہ اس کی طرف کوئی توجہ دی۔ دونوں وہاں سے گذر گئے اور آخر بیت المقدس پہنچے۔ شیخ نے سلمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اب جاؤ اور علم حاصل کرو۔ اس مسجد (اقصیٰ) میں سرزمین مقدس کے علماء آتے ہیں۔ سلمان رضی اللہ عنہ نکل پڑے اور اُن سے علم سننے لگے۔ ایک دن آپ بہت غمگین واپس لوٹے تو شیخ نے

Marfat.com

اُن سے پوچھا، سلمان! کیا بات ہے؟ آپ نے کہا میں دیکھتا ہوں کہ تمام خیر وبھلائی ان انبیاء اور ان کی اتباع کرنے والوں کے ساتھ ختم ہوگئی جو ہم سے پہلے اس دنیا میں تھے۔ اس پر شیخ نے کہا، سلمان! رنج وغم نہ کھاؤ، ابھی ایک نبی اور باقی رہ گئے ہیں، کوئی نبی ایسا نہیں گذرا ہے جسکے ان سے افضل اور بہتر اتباع کرنے والے رہے ہوں، ان کا زمانہ یہی ہے اس زمانہ میں اُن کی بعثت ہوگی، میں نہیں سمجھتا کہ میں بھی انہیں پاسکوں گا، ہاں تم ابھی جوان ہو، ممکن ہے تمہیں وہ مل جائیں، ان کی بعثت عرب کی سرزمین پر ہوگی، اگر تم انھیں پاسکو تو انپر ایمان لانا اور ان کی اتباع کرنا۔ سلمان رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ آپ مجھے مبعوث ہونے والے نبی کی کچھ نشانیاں بتادیں شیخ نے کہا، ہاں، ان کی پیٹھ پر "خاتم نبوۃ" کی مہر ہوگی، وہ ہدیہ کھالیں گے، لیکن صدقہ نہیں کھائیں گے۔ اس کے بعد دونوں حضرات وہاں سے واپس ہوئے۔ راستے میں پھر وہاں پہنچے جہاں وہ اپاہج راستے پر پڑا ہوا تھا اس نے پھر انہیں آواز دی کہ اے راہبوں کے سردار! مجھ پر رحم کیجئے، اللہ آپ پر رحم کرے گا اس مرتبہ انہوں نے اپنا گدھا اس کی طرف پھیر دیا اور اسے ہاتھ سے پکڑ کے زمین پر کھڑا کیا اور اس کے لئے دعا کی اور کہا کھڑا ہوجا اللہ کے حکم سے، چنانچہ وہ صحیح سالم کھڑا ہوگیا اور بڑی تیزی کے ساتھ دوڑنے لگا۔ سلمان رضی اللہ عنہ حیرت سے اسے . . . . . دیکھنے لگے۔ اتنے میں راہب وہاں سے روانہ ہوگئے اور سلمان رضی اللہ عنہ کی نظر سے اوجھل ہوگئے۔ آپ کو اس کا احساس بھی نہیں ہوا، لیکن بعد میں بہت گھبرائے اور اُن کی تلاش شروع کی۔ اس دوران میں آپ کی ملاقات عرب کے قبیلہ کلب کے دو آدمیوں سے ہوئی۔ آپ نے اُن سے پوچھا کیا تم نے راہب کو دیکھا ہے؟ ان میں سے ایک نے اپنی اونٹنی بٹھائی اور بولا، ہاں، یہ ہے اونٹوں کا چرواہا! اس نے آپ کو اپنے اونٹ پر لاد لیا اور آپ کو لیکر مدینہ پہنچا۔ سلمان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اس واقعہ سے مجھے اتنا صدمہ پہنچا کہ اپنی زندگی میں کبھی اتنا صدمہ کسی واقعہ سے بھی نہیں پہنچا تھا۔ پھر آپ کو قبیلہ جہینہ کی ایک عورت نے خرید لیا۔ آپ اور اس کا ایک اور غلام اس کی بکریاں چراتے تھے۔ باری مقرر کرلی تھی ایک دن آپ چرانے لیجاتے اور ایک دن وہ غلام۔ سلمان رضی اللہ عنہ نے درہم جمع کرنا شروع کیا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا انتظار کرنے لگے۔ ایک دن آپ بکریاں چرا رہے تھے کہ ان کا چرانے میں شریک غلام ساتھی آیا اور کہنے لگا، تمہیں معلوم ہے۔ آج مدینہ میں ایک شخص آیا ہے جس کا خیال ہے کہ وہ نبی ہے۔ سلمان رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا جبتک میں واپس آؤں بکریوں کی دیکھ بھال تم کرتے رہو چنانچہ آپ مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، آپ آنحضور کے چاروں طرف گھومنے لگے (خاتم نبوۃ کے مہر دیکھنے کے لئے) جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر آپ پر پڑی تو آپ کا مقصد بھانپ گئے اور اپنا کپڑا گرا دیا اور آنحضور کی ختم نبوۃ کھل گئی جب سلمان رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھ لیا تو آپ آنحضور کے سامنے آئے اور آپ سے گفتگو کی۔ اس کے بعد وہاں سے روانہ ہوئے اور ایک دینار سے بکری کا گوشت اور روٹی خریدی اور اسے لیکر آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضورؐ نے دریافت فرمایا، یہ کیا چیز ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ یہ صدقہ ہے۔ آنحضورؐ نے فرمایا، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، دوسرے (محتاج) مسلمانوں کو کھلا دو۔ پھر آپ وہاں سے چلے آئے۔ اور دوسرے دینار سے روٹی اور گوشت خریدا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لیکر حاضر ہوئے۔ آنحضرت نے دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ یہ ہدیہ ہے۔ آنحضرت نے فرمایا بیٹھ جاؤ۔ آپ بیٹھ گئے اور سب نے ملکر اسے کھایا۔ پھر گفتگو کے دوران میں سلمان رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کا ذکر کیا اور ان کے حالات آپ کو بتائے، کہا کہ وہ روزے رکھتے تھے، نماز پڑھتے تھے اور آپ پر ایمان رکھتے کہ آپ نبی بنا کر بھیجے جائیں گے۔ جب سلمان رضی اللہ عنہ ان کی تعریف وتوصیف کر چکے تو آنحضورؐ نے فرمایا، اے سلمان! وہ جہنمی تھے۔ سلمان رضی اللہ عنہ کو اس کا بڑا رنج ہوا۔ آپ آنحضورؐ سے یہ بھی کہہ چکے تھے کہ اگر وہ لوگ آپ کا زمانہ پاتے تو آپ کی تصدیق کرتے اور آپ کی اتباع کرتے۔ اس پر اللہ تعالٰے نے یہ آیت نازل کی "بیشک جو لوگ ایمان لاچکے ہیں اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی، (غرض) جو کوئی بھی اللہ پر ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے سو ان سب کے لئے ان کے پروردگار کے پاس ان کا اجر ہے"۔ تو یہودیوں کا ایمان یہ تھا کہ . . . تورات پر ایمان

Marfat.com

لائیں اور اسپر اور موسیٰ علیہ السلام کی سنت پر عمل کریں یہاں تک کہ عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے جب آپ کی بعثت ہوئی تو جو شخص توریت پر ایمان رکھتا اور اسپر اور موسیٰ علیہ السلام کی سنت پر عمل کرتا، لیکن عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع نہ کرتا تو وہ مومن نہیں ہو سکتا تھا۔ اور نصاریٰ کا ایمان یہ تھا کہ ان میں سے جو شخص بھی انجیل کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رہتا اور عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر عمل کرتا تو وہ مومن اور مقبول بندہ تھا یہانتک کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، اب ان میں سے جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع نہیں کرے گا تو وہ مومن نہیں ہو سکتا۔

آیت کی تفسیر میں مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نصاریٰ اور ان کے ان اعمال کا ذکر کیا جو انہوں نے خود دیکھا تھا تو آنحضورؐ نے فرمایا کہ ان کی موت اسلام پر نہیں ہوتی۔ سلمان رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ آنحضورؐ کے اس ارشاد کے بعد دنیا میرے لئے اندھیری ہو گئی۔ انہوں نے ان نصاریٰ کی عبادت و ریاضت میں مشقتوں کا ذکر کیا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ پھر آنحضورؐ نے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا کہ آیت تمہارے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کے بعد آنحضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر اور اس پر ایمان لانے کی حالت میں میری بعثت کی اطلاع سے پہلے مر گیا تو وہ خیر و بھلائی پر مرا ہے۔ لیکن آج جس شخص کو بھی میری بعثت کی اطلاع ہو گئی اور پھر بھی مجھ پر ایمان نہیں لایا تو وہ ہلاک و برباد ہو گیا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ مذکورہ بالا آیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی تھی "وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ" (اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کی تلاش کرے گا سو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ شخص آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہو گا) اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا خیال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہود، نصاریٰ اور صابئین کے ان افراد سے جو عمل صالح کریں آخرت میں جنت کا وعدہ کیا تھا (ان الذین آمنوا والذین ھادوا سے آخر تک والی آیت میں) لیکن پھر اس حکم کو مذکورہ بالا آیت " اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کی تلاش کرے گا تو وہ اس سے ہرگز نہیں قبول کیا جائے گا" سے منسوخ کر دیا۔ اس لئے مجاہد اور سدی رحمہما اللہ کے واسطے سے جو روایت ہم نے ذکر کی ہے اس کی بنیاد پر آیت کی تفسیر یہ ہو گی کہ " بیشک جو لوگ ایمان لا چکے ہیں اس امت میں سے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین، تو یہود، نصاریٰ اور صابئین میں سے جو بھی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لے آئے، ان کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے اور ان کے لئے نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ کوئی غم کریں گے"۔ لیکن جو تفسیر آیت کی ہم نے پہلے بیان کی ہے وہی قرآن مجید کی ترتیب سے واضح اور ظاہر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کے ساتھ عمل صالح پر اجر و ثواب کے لئے اپنی مخلوق کے کسی طبقہ کو خاص نہیں کیا ہے کہ ایک طبقہ کو تو اجر و ثواب ملے گا اور دوسرے کو نہیں ملے گا، اس لئے من آمن باللہ والیوم الآخر سے جو اطلاع دی جا رہی ہے وہ ان تمام طبقوں کو شامل ہو گی جنکا ذکر آیت کے شروع میں ہوا ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ

اور جب ہم نے تم سے قول و قرار لیا (کہ توراۃ پر عمل کرینگے) اور ہم نے طور پہاڑ کو اٹھا کر تمہارے اوپر (محاذات میں) معلق کر دیا اور کہا کہ (جلدی) قبول کرو جو کتاب ہم نے تمکو دی ہے مضبوطی کیساتھ اور

اذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ

یاد رکھو جو (احکام) اس کتاب میں ہیں جس سے توقع ہے کہ تم متقی بن جاؤ پھر تم اس قول و قرار کے بعد بھی (اس سے) پھر گئے، سو اگر تم لوگوں پر خدا تعالیٰ کا فضل اور رحم نہ ہوتا

عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

(تو اس عہد شکنی کا مقتضا تو یہ تھا کہ) فوراً تم (فوراً) تباہ (اور ہلاک) ہو جاتے۔

Marfat.com

میثاق "واذ اخذنا میثاقکم" (اور وہ وقت بھی یاد کرو جب ہم نے تم سے میثاق (عہد لیا)۔ "میثاق" مِفْعَال کے وزن پر "وَثِیْقَۃٌ" (قابل اعتماد، کام کی مضبوطی) سے نکلا ہے۔ میثاق (عہد) قسم کے ذریعہ بھی ہوسکتا ہے، وعدہ اور اس کے علاوہ دوسری قابل اعتماد چیزوں کے ذریعہ بھی ہوسکتا ہے۔ "واذ اخذنا میثاقکم" میں میثاق سے مراد وہ عہد ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر کیا ہے کہ اسنے بنی اسرائیل سے لیا تھا" وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا" (اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ عبادت نہ کرنا کسی کی بجز اللہ کے اور حسن سلوک سے پیش آنا اپنے ماں باپ سے) اور دوسری آیات جو اس کے بعد ذکر ہوئی ہیں۔ بنی اسرائیل سے میثاق لئے جانے کے سبب کا ذکر ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کے پاس سے الواح (جن پر تورات لکھی ہوئی تھی) لیکر واپس آئے تو اپنی قوم بنی اسرائیل سے فرمایا کہ ان الواح میں اللہ کی کتاب ہے اور اس کے احکام ہیں جن کا اس نے تمہیں حکم دیا ہے اور اس کی حرام کی ہوئی چیزوں کا ذکر ہے جن سے اُس نے تمہیں روکا ہے۔ اس پر وہ کہنے لگے کہ تمہاری تنہا کی بات کا کون یقین کرے گا، نہیں خدا کی قسم، ہم اس وقت تک یقین نہیں کرسکتے جب تک اللہ تعالیٰ کو ہم خود نہ دیکھ لیں اور وہ ہمارے سامنے نہ آجائے اور وہ خود کہے کہ یہ میری کتاب ہے، اس پر تم لوگ عمل کرو، آخر اللہ کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ خود ہم سے بات نہیں کرتا۔ بیان کیا کہ اس پر اللہ کا غضب اتر نازل ہوا اور ایک کڑک نے ان سب کی جان لے لی۔ بیان کیا کہ پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں دوبارہ زندہ کیا تو موسیٰ علیہ السلام نے ان سے پھر کہا کہ اللہ کی کتاب پر ایمان لاؤ لیکن وہ اب بھی اپنے انکار پر مصر رہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو بھیجا اور انہوں نے پہاڑ کو ان کے اوپر لٹکا دیا۔ اس وقت ان سے پوچھا گیا، کیا اسے بھی پہنچا نتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہاں یہ طور ہے۔ فرشتوں نے کہا کہ کتاب اللہ پر ایمان لاؤ ورنہ ہم اس پہاڑ کو تمہارے اوپر ڈال دیں گے۔ اس وقت انہوں نے میثاق (عہد) کیا تھا۔ آپ نے اس آیت کی تلاوت کی" واذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل لا تعبدون الا اللہ وبالوالدین احسانا" سے "وما اللہ بغافل عما تعملون" تک۔ بیان کیا گیا کہ اگر بنی اسرائیل کتاب اللہ پر پہلی ہی مرتبہ ایمان لائے ہوتے تو ان سے میثاق نہ لیا جاتا

طور "ورفعنا فوقکم الطور" (اور ہم نے تمہارے اوپر طور کو بلند کیا) "طور" کلام عرب میں پہاڑ کے معنی میں آتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ طور ایک خاص پہاڑ کا نام ہے، بیان کیا گیا کہ یہ وہی پہاڑ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے سرگوشی کی تھی بعض مفسرین کا خیال ہے کہ طور ایسے پہاڑ کو کہتے ہیں جس پر سبزہ اگتا ہو، خشک پہاڑ کو نہیں کہتے۔ مجاہد رحمۃ اللہ نے اس سے عام پہاڑ مراد لیا ہے۔ آپ سے روایت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو حکم دیا تھا کہ دروازہ سے جھکتے ہوئے شہر کے اندر داخل ہوں اور یہ کہتے ہوئے کہ توبہ ہے لیکن وہ نہیں جھکے، بلکہ سرین کے بل گھسٹتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے اور (حِطَّۃٌ یعنی توبہ ہے کے بجائے) حِنْطَۃٌ (گیہوں) کہا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے پہاڑ کو ان کے اوپر معلق کروا دیا۔ آپ نے بیان کیا کہ پہاڑ کو زمین میں سے جڑ سے اکھاڑ لیا گیا انھیں ڈرانے کے لئے ان کے اوپر چھتری کی طرح لٹکا دیا گیا۔ سریانی زبان میں طور پہاڑ کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ پھر انہوں نے سر کو جھکایا اور اسوقت بھی کن انکھیوں سے پہاڑ کو دیکھ رہے تھے۔ یہ وہی پہاڑ ہے جس پر اللہ رب العزت نے موسیٰ علیہ السلام کے لئے تجلی کی تھی۔ ایک روایت میں آپ سے ہے کہ بادل کی طرح اُن کے اوپر پہاڑ لٹکا دیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ ایمان لاؤ ورنہ تمہارے اوپر گرا دیا جائے گا۔ پھر وہ ایمان لائے۔ اور سریانی زبان میں پہاڑ کے لئے طور کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ ابو العالیہ اور عکرمہ رحمہما اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب انہوں نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی، تو اللہ تعالیٰ نے پہاڑ کو حکم دیا کہ ان پر گر پڑے۔ جب پہاڑ ان پر گرنے لگا اور وہ اس کی زد میں آگئے تو انہوں نے اس کی طرف دیکھا اور سجدہ میں گر گئے لیکن یہ بھی ایک پہلو سے کیا، دوسری طرف سے پہاڑ ہی کو دیکھتے رہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کو ان پر رحم آیا اور پہاڑ کو گرنے سے منع کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد" وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَھُمْ کَاَنَّہٗ ظُلَّۃٌ" (وہ وقت یاد کرو جب ہم نے ان کے اوپر پہاڑ معلق کر دیا تھا اس طرح کہ گویا وہ سائبان ہے) اور" ورفعنا فوقکم الطور" (اور ہم نے تمہارے اوپر طور کو بلند کیا) میں اسی

Marfat.com

واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی روایت ہے کہ پہاڑ کیلئے سریانی میں طور کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ طور اس مخصوص پہاڑی کا نام ہے جس پر اللہ تعالےٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے سرگوشی کی تھی۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ طور وہ پہاڑی ہے جس پر موسیٰ علیہ السلام پر توریت نازل ہوئی تھی اور بنی اسرائیل اس وقت اس کے نیچے موجود تھے۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ پہاڑی ان کے اوپر بلند کردی گئی تھی اور ان سے کہا گیا تھا کہ توریت پر ایمان لاؤ ورنہ یہ تمہارے اوپر گرا دی جائے گی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے یہ قول بھی نقل ہوا ہے کہ طور خاص اس پہاڑی کو کہتے ہیں جس پر سبزہ اُگتا ہو۔ جس پر سبزہ نہ آئے اُسے طور نہیں کہتے۔

حق پر استقلال کیلئے فہمائش

"خذ وا ما آتینا کم بقوۃ" (مضبوطی کے ساتھ اس کتاب کو پکڑ رکھو جو ہم نے تم کو دی ہے) بصرہ کے بعض نحویوں کا خیال ہے کہ آیت میں کچھ الفاظ حذف کردیئے گئے ہیں، کیونکہ آیت کی ترتیب سے پڑھنے والا انھیں خود سمجھ سکتا تھا، اس لئے ان کے ذکر کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔ آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ "اور ہم نے ان سے کہا کہ مضبوطی کے ساتھ اس کتاب کو پکڑ رکھو جو ہم نے تم کو دی ہے ورنہ اس پہاڑ کو ہم تمہارے اوپر پھینک ماریں گے"، لیکن کوفہ کے بعض نحویوں کا کہنا ہے کہ "قُلنَا" (ہم نے کہا) کو محذوف ماننے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ اخذ میثاق کا ذکر ہوا ہے، اور وہ خود قول ہے۔ البتہ "اَنْ" حذف مانا جا سکتا ہے، جیسے "اِنَّا اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖٓ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ" میں ہے "اَنْ" مذکور ہے۔

"خذ وا ما آتینا کم" سے مراد یہ ہے کہ جن باتوں کا توریت میں ہم نے تمہیں حکم دیا ہے۔ ایتاء اصل میں اعطاء (دینا) کے معنی میں آتا ہے اور "بقوۃ" کا مفہوم ہے کہ جو چیزیں توریت میں تم پر فرض ہوئی ہیں اور جن کا حکم ہوا ہے انھیں پوری پابندی اور استقلال کے ساتھ ادا کرو۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ "خذ وا ما آتینا کم بقوۃ" یعنی توریت میں جو کچھ ہے اس پر عمل کرو۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے کہ مطالبہ طاعت کا ہے۔ قتادہ اور سُدّی رحمہما اللہ سے عمل میں کوشش اور تندہی نقل ہوئی ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جو کتاب موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی ہے اسے اخلاص اور حق کے ساتھ پکڑ لو اس لئے آیت کی تفسیر یہ ہوگی کہ جو چیزیں ہم نے اپنی کتاب میں تم پر فرض کردی ہیں انھیں مان لو اور پھر پوری جد وجہد کے ساتھ ان پر عمل کرو، عمل میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرو۔ مضبوطی کیساتھ پکڑنے کا یہی مفہوم ہے" واذکر وا ما فیہ لعلکم تتقون" یعنی اپنی کتاب میں ہم نے تمہیں جو وعید (نافرمانی پر) اور وعدہ (فرمانبرداری پر) اور ترغیب وترہیب کی ہے اسے قبول کرو اور اس سے عبرت حاصل کرو اور ان پر غور وفکر کرو، کہ اگر تم نے ایسا کیا تو تم متقی بن جاؤ گے اور میرے عذاب سے ڈرنے لگو گے۔ پھر تمہیں اپنی گمراہی پر اصرار نہیں رہے گا اور بالآخر تم میری طاعت وعبادت کیطرف لوٹ آؤ گے، میری نافرمانی چھوڑ دو گے۔ "لعلکم تتقون" کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے "تاکہ تم ان اعمال سے باز آجاؤ جنھیں ابتک کرتے رہے ہو" اور انھیں اللہ تعالےٰ نے توریت دی تھی (جس کے احکام کو یاد رکھنے کا انھیں حکم ہوا ہے) ربیع اور ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہما نے فرمایا کہ "واذکروا ما فیہ" یعنی جو کچھ تورات میں ہے اسے یاد رکھو۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے کہ "واذکروا ما فیہ" یعنی جو کچھ اس میں ہے اسے اللہ کی طاعت اور اخلاص کے ساتھ یاد رکھو۔ آپ نے فرمایا، یعنی جو کچھ بھی اس میں ہے اسے یاد رکھو، اسے بھولو مت اور نہ اس سے کبھی غافل ہو۔

پھر وہی تلوّن

"ثم تولیتم من بعد ذالک" یعنی پھر تم اس عہد سے اس کے بعد پھر گئے۔ "تولیتم" "وَلَّانِیْ فُلَانٌ دُبُرَہٗ" سے نکلا ہے۔ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی شخص پشت پھیرلے اور اعراض کرے۔ پھر اس لفظ کا اطلاق ہر اس شخص پر ہونے لگا جو اللہ کی طاعت اور اس کے حکم کا تارک اور اس سے روگردانی کرنے والا ہو۔ بولتے ہیں "تَوَلّٰی فُلَانٌ عَنْ طَاعَۃِ فُلَانٍ" (فلاں نے فلاں کی فرمانبرداری نہیں کی) اللہ تعالےٰ کا یہ ارشاد "فَلَمَّآ اٰتٰہُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ بَخِلُوْا بِہٖ وَتَوَلَّوْا وَّہُمْ مُّعْرِضُوْنَ" (پھر اللہ نے جب ان کو اپنے فضل سے مال دے دیا تو لگے وہ اس میں بخل کرنے اور روگردانی کرنے اور منہ پھیرے ہوئے تو د

Marfat.com

تھے ہی) میں تَوَلّٰی سے یہی معنی مراد لیا گیا ہے، یعنی انھوں نے اللہ تعالےٰ سے جو وعدہ کیا تھا کہ " لَئِنْ آتَانَا مِنْ فَضْلِہٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَکُوْنَنَّ مِنَ الصَّالِحِیْنَ " (کہ اگر وہ اپنے فضل سے ہمیں مال عطا کردے تو ہم خوب اس میں سے صدقہ کریں گے اور ہم خوب نیک نیک کام کریں گے) اس کے انہوں نے خلاف کیا اور اپنے اس وعدہ کو پس پشت ڈال دیا، کلام عرب میں استعارہ کی بکثرت مثالیں موجود ہیں، ایک کلمہ کو اس کے ہم معنی دوسرے کلمہ کے بجائے کلام میں استعمال کا ان کے ہاں عام رواج ہے۔ " ثم تولیتم من بعد ذالک " کا مطلب یہ ہوگا کہ تم سے ہم نے کتاب اللہ پر عمل اور اس کے احکام کی بجا آوری میں جد وجہد کا جو عہد ومیثاق لیا تھا، تم نے اس پر عمل نہیں کیا، بلکہ تم نے اسے پس پشت ڈال دیا، حالانکہ تم نے اپنے پروردگار سے اس پر عمل کا عہد کیا تھا۔ پہلی آیت میں جن چیزوں کا ذکر ہے ان سب کی طرف " ذالک " سے اشارہ ہے یعنی " واذ اخذ نا میثاقکم ورفعنا فوقکم الطور " میں " فلولا فضل اللہ و رحمتہ لکنتم من الخاسرین " (پس اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم ضرور تباہ ہونے والوں میں ہوتے) یعنی تمہاری عہد شکنی کے بعد تمہیں توبہ کی توفیق دیکر اللہ تعالےٰ نے اگر تم پر اپنا فضل نہ کیا ہوتا کہ جب تم پر طور کو بلند کیا تو تم نے عہد کر لیا کہ اب اللہ کی طاعت اور اسکے فرائض کی بجا آوری میں پوری کوشش کرو گے اور کوئی ایسا کام نہیں کرو گے جس کی ممانعت اللہ تعالےٰ نے اپنی کتاب میں کی ہے تو اللہ تعالےٰ نے اسلام کی تمہیں توفیق دیکر اپنا انعام اور اپنی رحمت تم پر کی اور تمہاری خطاؤں کو معاف کیا اس کے بعد پھر اگر تم پر اللہ کا فضل نہ ہوتا تو تم یقیناً تباہ ہونے والوں میں ہو جاتے۔ آیت کے مخاطب اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودی ہیں لیکن واقعہ ان کے اسلاف کا ہے، جیسا کہ کئی مرتبہ اس سلسلہ میں ہم وضاحت کر چکے ہیں۔ عرب میں عام دستور تھا کہ ایک قبیلہ کا کوئی شخص دوسرے قبیلہ کے کسی شخص کو فخر اور اپنی بڑائی کرنے وقت اگر مخاطب کرتا تو واقعات اپنے اور اس کے اسلاف کے بیان کرتا، لیکن انہیں منسوب اپنی اور ان کی طرف کرتا جو اسوقت زندہ اور موجود ہوتے، کہتا کہ ہم نے تمہارے ساتھ یہ کیا اور یہ کیا۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ حضور اکرم کے دور کے یہودیوں کو اس لئے خطاب کیا گیا کہ اپنے اسلاف کی طرح ان کا بھی طرز عمل تھا اور یہ بھی وہی کرتے تھے جس کے ان کے اسلاف عادی تھے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ حضور اکرم کے دور کے یہودی چونکہ اپنے اسلاف کی ان خطاؤں سے واقف تھے اس لئے انھیں مخاطب کیا گیا ہے اس لئے مفہوم یہ ہوگا کہ چونکہ حضور اکرم کے زمانہ کے یہودی ان واقعات سے واقف تھے اس لئے ان کے واقعات کو بیان کرتے وقت ان کے ذکر کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ مخاطب کلام کے مقصد کو خود سمجھ لے گا۔ اس سلسلہ میں ہم نے سب سے پہلے جو تفسیر ذکر کی ہے وہی کلام عرب میں عام طور سے رائج ہے چنانچہ اس کے مطابق ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ اللہ کا فضل اسلام ہے اور اس کی رحمت قرآن مجید ہے۔ " خسران " کا مفہوم پہلے بیان ہو چکا ہے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا مِنْکُمْ فِی السَّبْتِ فَقُلْنَا لَہُمْ کُوْنُوْا قِرَدَۃً

اور تم جانتے ہی ہو اُن لوگوں کا حال جنھوں نے تم میں سے (شرع) سے تجاوز کیا تھا در بارہ (اُس حکم کے جو) یوم ہفتہ کے (متعلق تھا) سو ہم نے ان کو کہدیا کہ تم بندر ذلیل بن جاؤ

خَاسِئِیْنَ ○ فَجَعَلْنٰہَا نَکَالًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہَا وَمَا خَلْفَہَا وَ

پھر ہم نے اُس کو ایک (واقعہ) عبرت انگیز بنا دیا اُن لوگوں کے لئے بھی جو اس قوم کے معاصر تھے اور اُن لوگوں کے لئے بھی جو مابعد زمانہ میں آنے والے تھے

مَوْعِظَۃً لِّلْمُتَّقِیْنَ ○

اور نیز اس واقعہ کو موجب نصیحت بنایا (خدا سے) ڈرنے والوں کیلئے۔

Marfat.com

حد سے تجاوز

"ولقد علمتم الذین اعتدوا منکم فی السبت" (اور تم خوب جان چکے ہو ان لوگوں کو جنھوں نے تم میں سے سبت کے بارہ میں تجاوز کیا تھا) لقد علمتم یعنی تم خوب پہچانتے ہو۔ بولتے ہیں عَلِمْتُ اَخَاكَ وَلَمْ اَكُنْ اَعْلَمُهٗ یعنی تمہارے بھائی کو میں نے پہچان لیا پہلے میں اسے نہیں پہچانتا تھا۔ اسی معنی میں اللہ کا یہ ارشاد ہے وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ" (اور اُن کے علاوہ دوسروں پر بھی کہ تم انھیں نہیں پہچانتے اللہ انھیں پہچانتا ہے) الذین اعتدوا منکم فی السبت کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے میری مقرر کردہ حد سے تجاوز کیا اور سبت (سنیچر) کے دن جس چیز سے میں نے انھیں روکا تھا اسے انہوں نے کیا، اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ "اعتداء" حد سے تجاوز کرنے کو کہتے ہیں۔ اس آیت اور اس کے بعد کی آیات میں بھی مدینہ کے انھیں یہودیوں کو خطاب کیا گیا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے اور جن کا ذکر اس سورہ کی ابتدا سے ہوتا آرہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان آیات میں حضور اکرم کے زمانہ کے یہودیوں کو متنبہ کرتا ہے کہ ان کے اسلاف نے اپنے زمانہ کے انبیاء کے ساتھ جو طرز عمل اختیار کر رکھا تھا اور جس طرح اللہ کے احکام میں وہ حد سے تجاوز کرتے تھے اور اپنے کفر و عصیاں پر اڑے رہتے تھے کچھ وہی معاملہ ان کا بھی حضور اکرم کے ساتھ ہے اور اگر یہ باز نہ آئے تو اللہ کا غضب اور اس کا عذاب ان پر بھی نازل ہو سکتا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "لقد علمتم الذین اعتدوا منکم فی السبت" میں یہودیوں کو نافرمانی اور معصیت پر تحذیر و تنبیہ ہے، اللہ تعالیٰ ان سے فرماتا ہے، ڈرو کہیں تم پر بھی وہی عذاب نہ آجائے جو سبت (سنیچر) کے دن کے متعلق میرے حکم سے تجاوز کرنے والے تمہارے اسلاف بنی اسرائیل پر آیا تھا۔ "اعتدوا" یعنی سنیچر کے دن اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی انہوں نے جرأت کی۔ بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو جمعہ کے متعلق حکم دیا تھا اور اس کی فضیلت بتائی تھی، آسمان پر بھی فرشتوں کو اس دن کی تعظیم کا حکم ہے اور قیامت بھی اسی دن قائم ہوگی۔ اس لئے پچھلی جتنی امتیں اپنے انبیاء پر اس طرح ایمان لائیں جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت آپ پر ایمان لائی ہے تو انہوں نے جمعہ کو اس کی تمام عظمتوں کے ساتھ قبول کیا اور اس سلسلے میں بھی سمع و طاعت اختیار کی، اس دن کی فضیلت کو پہچانا اور ان احکام کو جو اللہ تعالیٰ نے اس دن سے متعلق رکھے تھے بجا لائے۔ لیکن جن لوگوں نے ایسا نہیں کیا وہ ان حد سے تجاوز کرنے والوں کی جماعت میں شامل ہو گئے جنکا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کیا ہے کہ "تم خوب جان چکے ہو ان لوگوں کو جنھوں نے تم میں سے سبت کے بارے تجاوز کیا تھا تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ" اس کا واقعہ یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کو جمعہ کے دن کی تعظیم کا حکم دیا اور اس کی فضیلت انھیں بتائی تو وہ کہنے لگے، اے موسیٰ! آپ ہمیں اس دن کی تعظیم کا کس طرح حکم دیتے ہیں اور اس دن کو تمام دنوں پر کیوں فضیلت دیتے ہیں، افضل تو سبت (سنیچر) کا دن ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین اور روزی ہفتہ کے چھ دنوں میں پیدا کی اور اسی سنیچر کے دن تمام چیزیں اللہ کی اطاعت پر مستقر ہو گئیں۔ ہفتہ کا آخری دن بھی یہی ہے۔ بیان کیا اسی طرح جب عیسیٰ ابن مریم علیہما الصلوٰۃ والسلام نے نصاریٰ سے جمعہ کی تعظیم کے لئے کہا تو انہوں نے بھی یہی جواب دیا کہ آپ جمعہ کی تعظیم کا ہمیں کس طرح حکم دیتے ہیں، ہفتہ کا سب سے پہلا دن سب سے افضل اور سب کا سردار ہوتا ہے (یعنی اتوار) اور اللہ ایک ہے اور پہلا (دن) بھی ایک ہے جو افضل ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے وحی کی کہ انھیں اتوار کی ہی تعظیم کرنے دو، البتہ اس دن انھیں فلاں فلاں چیزیں کرنی ہونگی لیکن انہوں نے اللہ کے حکم کے مطابق عمل نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی نافرمانی کا واقعہ اپنی کتاب میں بیان کیا۔ بیان کیا کہ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے بھی فرمایا تھا، جب یہودی سنیچر کی فضیلت پر مصر ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انھیں سنیچر کی تعظیم کرنے دو، لیکن انھیں حکم ہے کہ اس دن مچھلی یا کسی اور چیز کا شکار نہ کریں اور اس دن کوئی دوسرا کام بھی نہ کریں جیسا کہ انہوں نے خود کہا ہے۔ بیان کیا کہ پھر سنیچر کے دن مچھلیاں پانی کی سطح پر آجایا کرتی تھیں، اللہ تعالیٰ کے ارشاد "اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا" (جبکہ اُن کے سبت کے روز ان کی مچھلیاں ظاہر ہوتی تھیں) میں یہی واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ یعنی پانی کی سطح پر مچھلیاں آجاتی تھیں، ایسا اس لئے ہوتا تھا کہ انہوں نے اس معاملہ میں موسیٰ علیہ السلام کی نافرمانی کی تھی۔ لیکن باقی دوسرے دنوں میں مچھلیاں دستور

Marfat.com

کے مطابق پانی کے اندر ہی رہتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد "وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ لَا تَأْتِيهِمْ" (اور جب سبت نہ ہوتا تو نہ آتی تھیں) میں اس واقعہ کا دوسرا پہلو بیان کیا گیا ہے۔ مچھلیاں یہ سب کچھ اللہ کے منشا کے مطابق کرتی تھیں۔ مچھلیوں کو سنیچر کے دن جب بنی اسرائیل نے اس طرح پانی کی سطح پر دیکھا تو ان کے دل میں لالچ پیدا ہوا کہ انھیں پکڑیں۔ لیکن سزا کا خوف بھی دامن گیر تھا۔ اس کے باوجود ان میں چند ایسے تھے جنھوں نے اس دن مچھلی پکڑ ہی لی، اگرچہ موسیٰ علیہ السلام نے جس سزا سے انھیں ڈرایا تھا اس سے وہ خوف زدہ بھی تھے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ کوئی سزا اور عذاب ان پر نہیں آیا تو انہوں نے دوبارہ پھر سنیچر کے دن مچھلی پکڑی، بعضوں نے دوسروں سے بھی کہہ دیا کہ انہوں نے مچھلی پکڑی تھی اور ان پر کوئی عذاب نہیں آیا۔ اس کے نتیجہ میں مچھلی پکڑنے والوں کا اگلے سنیچر کو ہجوم ہو گیا، انہوں نے سمجھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی بات بالکل غلط تھی۔ اسی واقعہ کا ذکر اس آیت میں ہے کہ "ولقد علمتم الذين اعتدوا منكم في السبت فقلنا لهم كونوا قردة خاسئين" (اور تم خوب جان چکے ہو ان لوگوں کو جنھوں نے تم میں سے سبت کے بارے میں تجاوز کیا تھا تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ) اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد انھیں لوگوں کے متعلق ہے جنھوں نے سنیچر کے دن مچھلی کا شکار کیا تھا، پس اللہ تعالیٰ نے ان کی نافرمانی کی وجہ سے انھیں مسخ کر کے بندر بنا دیا، وہ بندر روئے زمین پر تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہے، مسخ ہونے کے بعد نہ انہوں نے کھایا نہ پیا اور نہ ان کی نسل چلی۔ اللہ تعالیٰ نے بندر، سور اور تمام مخلوق انھیں چھ دنوں میں پیدا کی تھی جن کا ذکر اس نے اپنی کتاب میں (آسمان و زمین کی پیدائش کے سلسلے میں) کیا ہے، لیکن بنی اسرائیل کے ان نافرمانوں کو اللہ تعالیٰ نے بندر کی صورت میں مسخ کیا تھا (اور ان کی نسل نہیں چلی تھی نہ وہ زندہ رہے تھے) اور اسی طرح اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

ایک دوسری روایت میں ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے نقل ہے کہ جس طرح تمہاری عید کے لئے جمعہ کا دن تم پر اللہ تعالیٰ نے فرض کیا ہے، بنی اسرائیل کی عید کے لئے بھی یہی دن فرض کیا تھا، لیکن انہوں نے نافرمانی کر کے سنیچر کا دن اختیار کر لیا اور اس دن کی تعظیم کرنے لگے اور اللہ کے حکم کو چھوڑ دیا۔ جب انھوں نے خود ہی سنیچر پر بہت اصرار کیا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں اس دن کے سلسلے میں آزمائش میں ڈالا اور اُن پر وہ چیزیں اس دن حرام کر دیں جو ان کے لئے باقی دنوں میں حلال تھی۔ بنی اسرائیل کی یہ جماعت مقام ایلہ اور کوہ طور کے درمیان مدین نامی ایک بستی میں رہتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر سنیچر کے دن مچھلی کا شکار اور اس کا کھانا حرام کر دیا۔ ادھر سنیچر کے دن ساحل سمندر کی طرف سے مچھلیوں کے جھنڈ کے جھنڈ ان کی طرف آتے تھے لیکن سنیچر کا دن گذرتے ہی تمام مچھلیاں پھر سمندر میں چلی جاتیں اور چھوٹی بڑی کسی طرح کی مچھلی بھی انھیں دکھائی نہ دیتی تھی۔ پھر جب سنیچر آتا تو مچھلیوں کا جھنڈ اسی طرح ان کی طرف بہتا چلا آتا اور دن کے گذرتے ہی غائب ہو جاتا۔ اس طرح جب بہت دن گذر گئے تو آخر ایک سنیچر کو انہیں سے ایک شخص نے چھپ کے ایک مچھلی پکڑ ہی لی۔ لیکن اسے دھاگے میں باندھ کے پانی میں ڈال دیا اور کنارے ایک کھونٹی زمین پر گاڑ کر دھاگے کا دوسرا سرا اس کھونٹی میں باندھ دیا اور دوسرے دن آ کر اسے پانی میں سے نکال لیا اس نے کہا کہ سنیچر کے دن میں نے مچھلی نہیں پکڑی ہے۔ آخر وہ مچھلی کو لیکے اپنے گھر گیا اور اسے کھایا۔ اگلے سنیچر کو بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ محلہ والوں نے بھی مچھلی کی بو سونگھ لی اور کہنے لگے کہ مچھلی کی بو آ رہی ہے۔ اس شخص نے جس ترکیب سے مچھلی پکڑی تھی انھیں بھی اس کا علم ہوا۔ چنانچہ انہوں نے بھی (جنھیں یہ ترکیب معلوم ہو گئی تھی) اسی شخص کی طرح مچھلی پکڑی اور ایک زمانہ تک چھپ چھپ کے یونہی شکار کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے سزا دینے میں جلدی نہیں کی۔ پھر جب وہ کھلے بند شکار کرنے لگے۔ اور بازاروں میں بیچنے بھی لگے تو بعض لوگ جو ان میں متقی اور نیک تھے انہوں نے کہا کہ اللہ سے ڈرو، انہوں نے ان شکاریوں کو اس طرح شکار کرنے سے منع کیا۔ انھیں بنی اسرائیل میں ایک تیسری جماعت تھی جس نے اگرچہ اس طرح شکار کی ہوئی مچھلی نہیں کھائی تھی لیکن ان شکاریوں کو روکتی بھی نہیں تھی، بلکہ جو لوگ روکتے تھے ان سے یہ کہتے کہ میاں، ایسے لوگوں کو وعظ و نصیحت سے کیا فائدہ جنھیں اللہ تعالیٰ ہلاک کرے گا اور انھیں شدید عذاب دے گا۔ دوسری جماعت کہتی کہ اس طرح ہم گویا اپنے رب کے حضور میں معذرت کرتے ہیں کہ کہیں ہم بھی ان کے اعمال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی لپیٹ میں

Marfat.com

آجائیں اور یہ بھی امید ہے کہ یہی متقی بن جائیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ اس عرصہ میں ایک دن بنی اسرائیل کے جو متقی اور پرہیزگار لوگ تھے وہ اپنی مجلسوں اور مسجدوں میں صبح کے وقت پہنچے تو ان لوگوں میں سے کوئی بھی نظر نہ آیا۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کوئی حادثہ پیش آیا ہے، چل کے دیکھنا چاہیئے کہ کیا بات ہوئی۔ چنانچہ یہ دیکھنے کے لئے اُن کے گھروں پر گئے تو تمام دروازے بند تھے۔ وہ لوگ رات میں اپنے گھروں میں گئے اور اندر سے دروازہ بند کر لیا، جیسا کہ عام طور سے ہر شخص کرتا ہے لیکن صبح کے وقت وہ سب بندر بن چکے تھے، مرد اپنے کو جانتے پہچانتے تھے لیکن بندر کی شکل اختیار کئے ہوئے تھے، یہی حال عورتوں اور بچوں کا بھی تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ اگر یہ واقعہ نہ ہوتا کہ اللہ تعالےٰ ان لوگوں کو نجات دیتا ہے جو گناہ سے لوگوں کو روکتے ہیں تو سب کو ہلاک کر دیتا کہتے ہیں کہ یہی وہ بستی ہے جس کے متعلق اللہ تعالےٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ " وَاسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ " (اور آپ ان سے اس بستی والوں کی بابت دریافت کیجئے جو سمندر کے کنارے پر تھی)

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ مچھلی کے شکار کے سلسلے میں بنی اسرائیل کی اس بستی والوں کے تین فرقے ہو گئے تھے، ایک تو وہ جنھوں نے خود بھی شکار نہیں کیا اور شکاریوں کو منع بھی کیا۔ دوسرے وہ جنہوں نے صرف اپنا دامن شکار سے بچائے رکھا (لیکن شکاریوں کو منع نہیں کیا) تیسرا طبقہ وہ تھا جس نے اللہ کی حرمت کو توڑا اور نافرمانی اور سرکشی پر جما رہا جب وہ نافرمانی سے کسی طرح باز نہیں آئے تو اللہ تعالےٰ نے انھیں حکم دیا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ۔ آپ نے فرمایا کہ وہ سب بندر بن گئے۔ بندروں کی طرح اُن کے پونچھ تھی اور انھیں کی طرح وہ اچھل کود رہے تھے۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ اچھے خاصے مرد اور عورتیں تھیں۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ آیت کا واقعہ ایلہ کے یہودیوں کا ہے، یہودیوں کی یہ بستی دریا کے ساحل پر واقع تھی۔ قرآن مجید کی آیت " اور اُن سے اس بستی والوں کے متعلق دریافت کیجئے جو سمندر کے کنارے پر تھی" انھیں کے بارے میں ہے۔ آپ کی روایت کے مطابق بنی اسرائیل کے نافرمانوں نے شکار کی ترکیب یہ نکالی تھی کہ سنیچر کے دن لب دریا ایک گڑھا کھود لیتے تھے اور ایک نالے کے ذریعہ اس گڑھے کو دریا سے ملا دیتے تھے۔ جب کوئی لہر آتی تو اس نالے کے ذریعہ مچھلیاں اس گڑھے میں چلی آتیں، لیکن چونکہ پانی اس میں کم ہوتا تھا اس لئے اس سے نکل نہیں پاتی تھیں۔ اور اس طرح اتوار کے دن وہ ان مچھلیوں کو پکڑ کر گھر لے جاتے تھے پہلے ایک شخص نے یہ ترکیب نکالی۔ پھر اس کے پڑوسی کو معلوم ہوا اور پھر اسی طرح بہت سے لوگوں کو معلوم ہو گیا جو لوگ مومن اور متقی تھے انہوں نے پہلے تو منع کیا لیکن جب وہ باز نہ آئے تو انہوں نے کہا کہ ہم تمہارے ساتھ ایک بستی میں نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ اس بستی کے دو حصے کر دیئے اور بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر دی۔ ایک حصہ میں مومن رہتے تھے اور دوسرے میں نافرمان اور سرکش۔ پھر مسلمانوں نے اپنی دیوار میں ایک دروازہ کھول دیا اور ان نافرمانوں نے بھی ایک دروازہ کھول لیا۔ داؤد علیہ السلام نے بھی ان پر لعنت کی۔ مسلمان اپنے دروازے سے نکل کر دوسری طرف جایا کرتے تھے۔ اور نافرمان و سرکش بھی مسلمانوں کی طرف آیا کرتے تھے۔ ایک دن مسلمانوں میں سے تو بہت سے افراد ان کی طرف گئے لیکن انہوں نے اپنی طرف کا دروازہ ہی نہیں کھولا، جب بہت دیر ہو گئی تو کچھ مسلمان دیوار پر چڑھے اور دیکھا کہ سب بندر بن گئے ہیں اور ایک دوسرے پر اچھل کود رہے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کے ارشاد " فَلَمَّا عَتَوْا عَمَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ (پھر جب وہ اس چیز کی حد سے نکل گئے جس سے وہ روکے گئے تھے تو ہم نے اُن سے کہدیا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ) اور " لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ " (بنی اسرائیل میں سے جنھوں نے کفر اختیار کیا، ان پر لعنت ہوئی داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے) میں انھیں کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے، یعنی جنھیں بندر بنا دیا گیا تھا۔ لیکن مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ صورت ان کی مسخ نہیں کی گئی تھی بلکہ یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالےٰ نے ان کے لئے بیان کی ہے جیسے ایک دوسرے موقعہ پر " كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا "

Marfat.com

ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جو کتابیں لادے ہو) کی مثال بیان کی گئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ان کے دل مسخ کر دیئے گئے تھے، واقعی بندر کی صورت میں انھیں نہیں کیا گیا تھا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول اس مفہوم سے بالکل مختلف ہے جسے آیت واضح اور صاف طور پر بتاتی ہے، کیونکہ اللہ تعالےٰ نے تو ان کے متعلق فرمایا ہے کہ "اللہ نے انہیں سے بندر، سور اور باطل کے پوجنے والے بنا دیئے" دوسرے موقعہ پر اسی طرح اپنے نبی سے ان کے اس مطالبہ کو صاف طریقے پر اللہ تعالےٰ نے بیان کیا کہ " اَرِنَا اللّٰہَ جَھْرَۃً " (ہمیں خدا کو علانیہ دکھا دیجئے) اور یہ کہ جب انہوں نے یہ گستاخانہ سوال کیا تو انھیں سخت کڑک نے آ لیا، ایک موقعہ پر ان کی گوسالہ پرستی کا ذکر صاف لفظوں میں ہے اور اس کے بعد، کہ اس گناہ سے ان کی توبہ یہ مقرر کی گئی کہ وہ آپس میں ہی ایک دوسرے کو قتل کریں، ان کے متعلق اس کا بھی ذکر قرآن مجید میں ہے کہ سر زمین مقدس میں انھیں داخلہ کا حکم ہوا تو اپنے نبی سے انہوں نے کہا کہ آپ اور آپ کا رب جائیں اور جنگ کریں، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ اس کی سزا میں اللہ تعالیٰ نے انھیں میدان تیہ میں مبتلا کیا۔ زیر تفسیر آیت میں بھی جو انھیں نافرمانی اور عناد کی سزا دی گئی تھی وہ صاف طور پر بیان کر دی گئی۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ ان کی صورت مسخ کر کے بندر جیسی نہیں بنائی گئی تھی حالانکہ اللہ تعالےٰ نے خود ان کے متعلق فرما دیا ہے کہ ان میں سے بندر اور سور بنائے گئے تھے۔ تو اس کا یہ قول ایسا ہی ہوا جیسے کوئی شخص ان تمام آیات کی تاویل کرنے لگے جنھیں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنے عذاب اور اپنی سزاؤں کا ذکر کیا ہے اور کہنے لگے کہ واقعتہً یہ سزائیں مراد نہیں ہیں بلکہ تمثیل کے طور پر ان کا ذکر ہوا ہے تو اس سے کہا جائے گا کہ اپنے اس دعوے پر کوئی دلیل بیان کرے، کیونکہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہ قرآن کے ظاہر اور واضح مفہوم کے خلاف ہے۔ اب اگر وہ کوئی دلیل بیان کرتا ہے تو اُسے پرکھا جائے گا کہ وہ اس درجہ اور مرتبہ کی ہے بھی یا نہیں جس سے قرآن کے ظاہری مفہوم میں تاویل کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ان تمام ثقہ علماء کے قول کے خلاف ہے جن کا کسی غلط بات پر اتفاق نہیں ہو سکتا اور یہی اس قول کے فساد کے لئے کافی ہے۔

عذاب

"فَقُلْنَا لَھُمْ کُوْنُوْا قِرَدَۃً خَاسِئِیْنَ" (پس ہم نے اُن سے کہا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ) یعنی ہم نے ان لوگوں سے کہا جنھوں نے سنیچر کے دن کے معاملہ میں حد سے تجاوز کیا تھا۔ "سبت" کا اصل مفہوم راحت و خوش حالی زندگی کا سکون واطمینان ہے اسی لئے سونے والے کو "مسبوت" کہتے ہیں کیونکہ نیند کے عالم میں اس کا جسم پوری طرح آرام و راحت میں ہوتا ہے، اللہ تعالےٰ نے بھی ارشاد فرمایا ہے "وَجَعَلْنَا نَوْمَکُمْ سُبَاتًا" یعنی ہم نے تمہاری نیند کو تمہارے جسم کے لئے راحت و سکون کا باعث بنایا۔ سَبَتَ فُلَانٌ یَسْبِتُ سے یہ مصدر ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ چونکہ سنیچر (سبت) سے ایک دن پہلے جمعہ کے دن اللہ تعالےٰ اپنی تمام مخلوقات کو پیدا کر کے فارغ ہوا تھا، اس لئے جمعہ کے بعد والے دن (سنیچر) کا نام "سبت" پڑا۔ "کُوْنُوْا قِرَدَۃً خَاسِئِیْنَ" میں کُوْنُوْا، صِیْرُوْا کے معنی میں ہے (ہو جاؤ)۔ "خاسی" جس کی جمع خاسئین ہے) راندۂ درگاہ، رحمت سے دور کو کہتے ہیں یہ لفظ کتے کو دھتکارنے کیلئے بھی استعمال کرتے ہیں مطلب یہ ہے کہ "ہو جاؤ بندر، خیر و رحمت سے دور اور ذلیل وحقیر"۔ مجاہد، قتادہ اور ربیع رحمہم اللہ نے خاسئین کا یہی مفہوم بیان فرمایا ہے اور یہی ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔

"فَجَعَلْنَاھَا نَکَالًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْھَا وَمَا خَلْفَھَا" (پھر ہم نے اسے موجب عبرت بنا دیا اس زمانہ کے اور اس کے بعد کے لوگوں کیلئے) مفسرین کا اس میں اختلاف ہے کہ "فَجَعَلْنَاھَا" میں "ھا" کی ضمیر سے کیا مراد ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "ھا" کی ضمیر سے مراد "عقوبۃ" (سزا، عذاب) ہے یعنی ہم نے مسخ کی اس عقوبۃ (سزا) کو باعث عبرت بنا دیا، گویا "فَجَعَلْنَاھَا" میں "ھا" کی ضمیر مسخ کی طرف لوٹتی ہے۔ اس تفسیر کی بنیاد پر آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ "ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ، چنانچہ مسخ ہو کر وہ بندر ہو گئے اور اپنی اس سزا یعنی اُن کے مسخ کو ہم نے اس زمانہ اور اس کے بعد کے زمانہ کے لوگوں کے لئے باعث عبرت بنا دیا، اور خوف خدا رکھنے والوں کے لئے موجب نصیحت بنا دیا۔ دوسرا قول ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے یہ منقول ہے کہ "ھا" کی ضمیر "حیتانان" (مچھلیوں) کی طرف لوٹتی ہے۔ اگرچہ مچھلیوں کا ذکر آیت میں صراحت کے ساتھ کہیں بھی موجود نہیں ہے، لیکن چونکہ

Marfat.com

واقعہ میں اس کی طرف دلالت ہے یعنی " لقد علمتم الذین اعتدوا منکم فی السبت " میں اس لئے اسے مقدر مانا جاسکتا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ " ھا " کی ضمیر " قریۃ " (بستی) کی طرف لوٹتی ہے، جس کے باشندوں نے سنیچر کے دن کے بارے میں حد سے تجاوز کیا تھا۔ ایک اور قول یہ ہے کہ ضمیر " قردۃ " (بندر) کی طرف لوٹتی ہے جو پہلے انسان تھے اور اب مسخ کر کے بندر بنا دیئے گئے تھے، ایک قول یہ ہے کہ " امۃ " کی طرف ضمیر لوٹائی جائے یعنی وہ امت (جماعت) جس نے سنیچر کے بارے میں حد سے تجاوز کیا تھا۔ " نکال " مصدر ہے، اس کا اصل معنی عقوبت اور سزا ہے۔ عدی بن ثابت عبادی نے اس کا یہی مفہوم لیا ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی منقول ہے۔

" لما بین یدیھا وما خلفھا " کی تفسیر کے سلسلے میں بھی مختلف اقوال ہیں ضحاک رحمۃ اللہ علیہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں " تاکہ وہ لوگ میری سزا سے عبرت حاصل کریں جو ان کے بعد آئیں گے اور وہ لوگ بھی جنھیں وہ چھوڑ کے مسخ ہوئے یعنی جو ان کی قوم کے باقی بچ گئے تھے۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے۔ دوسرا قول خود ابن عباس رضی اللہ کا ہے جسے ان کے مولا عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے یہ ہے کہ " ما بین یدیھا وما خلفھا " سے مراد بستی والوں میں سے ہی ہیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ " ما بین یدیھا " سے مراد اُن کے گناہ ہیں اور " ما خلفھا " سے مراد وہ مچھلیاں ہیں جو انہوں نے پکڑی تھیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ " ما خلفھا " سے مراد اُن کے وہ گناہ ہیں جن کی پاداش میں وہ ہلاک ہوگئے اور " ما بین یدیھا " سے مراد وہ گناہ ہیں جو پہلے انہوں نے کئے تھے۔ سدی رحمۃ اللہ سے روایت ہے کہ " ما بین یدیھا " سے مراد ان کے وہ اعمال ہیں جو انہوں نے کئے تھے، اور " ما خلفھا " سے مراد اُن کے بعد آنے والی اُمتیں ہیں کہ اگر وہ بھی اسی طرح نافرمانی کریں گی تو اللہ تعالےٰ انکے ساتھ بھی یہی معاملہ کرے گا۔ ایک قول اس سلسلے میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ بھی منقول ہے کہ " فجعلناھا نکالا لما بین یدیھا وما خلفھا " کا مطلب یہ ہے کہ مچھلیوں کو ہم نے ان کے اگلے پچھلے اعمال کا عذاب بنا دیا، یعنی جو اعمال وہ مچھلیوں کے واقعہ کے زمانہ میں کرتے تھے اور جو اس سے پہلے کرتے تھے اس کی سزا مچھلیوں کے ذریعہ ان کی آزمائش اور پھر اس پر عذاب کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

ان تمام تفسیروں میں سب سے بہتر تفسیر وہ ہے جو ہم نے سب سے پہلے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ کے واسطہ سے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے، ہم نے پہلے اس کی وضاحت کر دی ہے کہ " فجعلناھا نکالا " میں " ھا " کی ضمیر سے مراد عقوبت اور مسخ مراد لینا دوسری تمام تفسیروں سے بہتر ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ آیت میں اپنی مخلوق کو اپنی سطوت اور اپنے دبدبہ سے ڈرایا ہے اور یہ مفہوم زیادہ واضح عقوبت و مسخ مراد لینے ہی کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس کے بعد " ما بین یدیھا وما خلفھا " کی ضمیر " ھا " سے بھی یہی مراد لینا زیادہ بہتر ہوگا اور ضمیر " ھا " سے عقوبت و مسخ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر کی بنیاد پر ہی مراد لینا ممکن ہے اب آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جب انہوں نے حد سے تجاوز کیا تو ہم نے اُن سے کہا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ، اور ہم نے ان پر اپنی عقوبت اور عذاب کو جو ان کے اگلے پچھلے گناہوں کی سزا تھی دوسرے ایسے لوگوں کے لئے باعث عبرت بنا دیا جو اُن کے بعد انھیں جیسے اعمال کریں کہ انھیں بھی ویسی ہی سزا دی جا سکتی ہے اور انھیں بھی مسخ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے اپنے بندوں کو تنبیہ ہے کہ اس طرح کے اعمال نہ کریں جیسے کہ ان لوگوں نے کئے تھے جنھیں مسخ کر دیا گیا، کہیں ان پر بھی وہی عذاب نہ نازل ہو جائے جن مفسرین نے " فجعلناھا " کی ضمیر " حیتان " (مچھلیوں) کی طرف لوٹائی ہے وہ آیت کے مفہوم اور عربی قواعد کے اعتبار سے بہت بعید ہے، کیونکہ ان کا تو آیت میں کوئی تذکرہ ہی سرے سے نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس سلسلے میں کوئی حدیث منقول نہیں ہے اور آیت کے ظاہر کے بھی خلاف ہے، اس لئے " حیتان " کی طرف ضمیر لوٹانا مناسب نہ ہوگا۔ جن لوگوں نے اس کی ضمیر " قریۃ " کی طرف لوٹائی ہے۔ انہوں نے بھی یہی غلطی کی ہے۔

خوف خدا رکھنے والوں کیلئے نصیحت

" وموعظۃ للمتقین " (اور موجب نصیحت بنا دیا خوف خدا رکھنے والوں کیلئے)

" موعظۃ " مصدر ہے، بولتے ہیں " وعظت الرجل " میں نے اس شخص کو نصیحت

Marfat.com

کی۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ " اس واقعہ کو ہم نے متقیوں کے لئے تذکرہ اور نصیحت بنا دیا کہ اس سے نصیحت و موعظت حاصل کریں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ " للمتقین " یعنی خوف خدا رکھنے والے اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو اللہ کے فرائض کی ادائیگی اور اس کی نافرمانی سے بچنے میں اس سے ڈرتے رہتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ " وموعظۃ للمتقین " یعنی مومنین جو شرک سے بچتے ہیں اور میری طاعت و عبادت کرتے رہتے ہیں۔ تو اللہ تعالے نے سنیچر کے دن کے معاملہ میں حد سے تجاوز کرنے والوں کے واقعہ کو خاص مومنین اور متقین کے لئے موجب نصیحت و موعظت بنایا ہے اور کافروں، منکروں کے لئے باعث عبرت بنایا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہ واقعہ قیامت تک کے مومنین کے لئے باعث موعظت و نصیحت ہے ابن جریج ربیع اور قتادہ رحمہم اللہ سے بھی یہی روایت ہے کہ ان کے بعد میں آنے والے متقیوں کے لئے باعث موعظت و نصیحت ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ مراد امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے کہ ان کے لئے موجب موعظت و نصیحت ہے[۱]۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ

اور وہ زمانہ یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ حق تعالیٰ تم کو حکم دیتے ہیں کہ تم ایک بیل ذبح کرو۔ وہ لوگ کہنے لگے کہ کیا آپ ہم کو مسخرہ بناتے ہیں۔ موسیٰ

قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا هِیَ ؕ

علیہ السلام نے فرمایا نعوذ باللہ جو میں ایسی جہالت والوں کا سا کام کروں۔ وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ درخواست کیجئے ہمارے واسطے اپنے رب سے کہ ہم کو بیان کر دیں کہ اس (بیل) کے کیا اوصاف ہیں آپ نے

قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَیْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۝

فرمایا کہ وہ (میری درخواست کے جواب میں) یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسا بیل ہو کہ نہ بالکل بوڑھا ہو نہ بہت بچہ ہو (بلکہ) پٹھا ہو دونوں عمروں کے درمیان سو اب زیادہ تحقیقات مت کیجئے) بلکہ کر ڈالو جو کچھ تم کو

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ

ملا ہے۔ کہنے لگے کہ (اچھا یہ بھی) درخواست کر دیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے کہ ہم سے یہ بیان کر دیں کہ اسکا رنگ کیسا ہو آپ نے فرمایا کہ (اسکے متعلق) حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک زرد رنگ کا بیل ہو جسکا رنگ تیز زرد

لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا هِیَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَیْنَا ؕ

ہو کہ ناظرین کو فرحت بخش ہو کہنے لگے کہ ہماری خاطر اپنے رب سے دریافت کر دیجئے کہ ہم سے بیان کر دیں کہ اس کے اوصاف کیا ہوں کیونکہ اس بیل میں (قدرے) اشتباہ ہے۔

[۱] صاحب روح المعانی نے اس آیت کے ذیل میں ایک عارفانہ نکتہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالے نے تمام عبادتوں کو خاص خاص ہیئت کے ساتھ متعین کیا ہے اور ان کے لئے اوقات بھی مخصوص رکھے ہیں، تاکہ طبعی ظلمتیں دور ہوں، پس جو شخص شریعت کی متعین کردہ ان ہیئتوں کی رعایت نہیں کرتا اس کا نور استعداد ضائع ہو جاتا ہے اور وہ اصحاب سبت کی طرح مسخ کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اس امت کے لئے صورت اور ظاہر کا مسخ نہیں ہے، اس لئے جس جانور کے اوصاف اس میں راسخ ہوتے ہیں اسی کی طبیعت اس میں پیدا کر دی جاتی ہے۔ پس ہر شخص کو چاہیئے کہ شریعت کی متعین کردہ ہیئت کی پوری طرح رعایت کرے، تاکہ اس کی انسانیت محفوظ رہ سکے۔ ہر زمانہ میں بعض اہل کشف ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو انسان کو اسی حیوان کی شکل میں دیکھتے ہیں جس کی صفت حیوانی اس پر غالب ہوتی ہے۔ مثلاً جس پر ظلم و شقاوت غالب ہوتی ہے۔ اسے دیکھتے ہی پکار اٹھتے ہیں کہ یہ بھیڑیا ہے۔ وعلیٰ ھذا القیاس۔

(مترجم)

Marfat.com

وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ

اور ہم ضرور انشاء اللہ تعالیٰ (ابکی بار) ٹھیک سمجھ جاویں گے موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ وہ نہ تو ہل میں چلا ہوا ہو جس سے زمین جوتی جائے نہ اس سے زراعت کی

وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ۭ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۭ فَذَبَحُوْهَا

آبپاشی کیجاوے (غرض ہر قسم کے عیب سے) سالم ہو اور اس میں کوئی داغ نہ ہو یہ کہنے لگے کہ (ہاں) اب آپ نے پوری (اوصاف) بات فرمائی (پھر) اسکو ذبح کیا اور وہ اس کی تعمیل

وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝

سے ظاہر اکرتے ہوئے معلوم ہوتے نہ تھے۔

گائے ذبح کرنے کا حکم

"واذ قال موسٰی لقومہ ان اللہ یامرکم ان تذبحوا بقرۃ، قالوا اتتخذنا ھزوا"

بھی ان آیتوں میں سے ایک ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم کے زمانہ کے یہودیوں کو اس بنا پر تنبیہ کی ہے کہ ان کے اسلاف نے بھی وہ عہد و میثاق توڑا تھا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کی پیروی کے سلسلے میں اُن سے لیا تھا۔ ارشاد ہے، میرے ایک اور عہد کا توڑنا یاد کرو، جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم (بنی اسرائیل) سے کہا کہ جو شخص تم میں سے قتل کیا گیا ہے اس کے سلسلے میں اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو تو انہوں نے کہا کیا آپ ہم سے ہنسی کر رہے ہیں؟ "ھزو" کھیل اور ہنسی کے معنی میں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انبیاء اللہ تعالیٰ کی طرف سے امر و نہی کی جو خبر امتوں کو دیتے ہیں انہیں ہنسی یا کھیل کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن موسیٰ علیہ السلام کے متعلق بنی اسرائیل کو یہی خیال ہوا کہ مقتول کے بارے میں ان کے جھگڑے کو رفع کرنے کے لئے آپ گائے ذبح کرنے کا جو حکم دے رہے ہیں وہ محض مذاق ہے "اتتخذنا ھزوا" میں "فا" حذف ہے، یہ جملہ "ان اللہ یامرکم الخ" کے جواب میں واقع ہوا ہے۔ ایسے موقعہ پر "فا" کا نہ ذکر کرنا ہی بہتر سمجھا جاتا ہے اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کا جواب نقل فرمایا کہ "قال اعوذ باللہ ان اکون من الجاھلین" خدا مجھے اس سے پناہ میں رکھے کہ میں جاہلوں میں ہو جاؤں (یعنی ہنسی اور مذاق کی باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے والا وہ ہو سکتا ہے جو اللہ کی عظمت و کبریائی اور اس کی ذات و صفات سے ناواقف ہو۔ میں اس سے بری ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام نے انھیں گائے ذبح کرنے کا حکم جو دیا تھا اس کی وجہ عبیدہ رحمۃ اللہ سے یہ منقول ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک بے اولاد شخص تھا۔ اس کے رشتہ دار نے اسے قتل کر دیا پھر اسے اٹھا کر اپنے قبیلہ سے دور ایک دوسرے قبیلہ میں لے جا کے ڈال آیا۔ اس پر اُن میں آپس میں بڑا شدید نزاع و اختلاف پیدا ہو گیا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ فریقین نے ہتھیار اُٹھا لئے۔ جو لوگ دانشمند تھے انہوں نے روکا اور کہا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے یہاں موجود ہیں اور اس کے باوجود تم لوگ آپس میں لڑائی کرتے ہو۔ چنانچہ سب اللہ کے نبی (موسیٰ علیہ السلام) کے پاس آئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ گائے ذبح کرو تو وہ بولے، کیا آپ ہم سے ہنسی کر رہے ہیں۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں جاہلوں میں ہو جاؤں۔ وہ بولے کہ آپ اپنے پروردگار سے ہماری طرف سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ گائے کیسی ہو۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہو، نہ بن بیائی" اللہ تعالیٰ کے ارشاد" پھر انہوں نے اسے ذبح کیا اور وہ ایسا کرتے معلوم نہیں ہوتے تھے تک بیان کیا کہ پھر انہوں نے مقتول پر گائے کا کوئی ٹکڑا مارا تو اس نے اپنے قاتل کے متعلق خود ہی بتا دیا۔ بیان کیا کہ جن اوصاف کی گائے مطلوب تھی اس کی قیمت میں اسی گائے کے برابر سونا دینا پڑا۔ بیان کیا کہ (اگر وہ پہلے حیل و حجت نہ کرتے اور اللہ تعالیٰ کے ابتدائی حکم پر معمولی گائے بھی خرید لیتے تو کافی ہوتی۔ آخر قاتل (جو مقتول کا رشتہ دار تھا) اس کے مال کا وارث نہ ہو سکا۔ ابو العالیہ رحمۃ علیہ سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک مالدار شخص تھا، ساتھ ہی لاولد بھی تھا البتہ اس کا ایک رشتہ دار تھا جو مرنے کے بعد اس کا وارث بنتا۔ اس نے وراثت کی لالچ

Marfat.com

میں اسے قتل کر دیا اور ایک عام گذرگاہ پر لاش کو ڈال آیا۔ لاش کے قریب موسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو اس سے آواز آئی کہ میرے رشتہ دار نے مجھے قتل کر دیا ہے، اور اے اللہ کے نبی! آپ کے سوا کوئی ایسا نہیں جو اس قتل کے راز کو کھول سکے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے لوگوں میں اعلان کر دیا کہ میں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ اگر کسی کے پاس بھی اس سلسلے میں کوئی علم ہو تو وہ ہمارے سامنے آ کے بیان دے لیکن اس راز سے کوئی واقف نہ تھا۔ اس کے بعد قاتل نے خود ہی موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ اللہ کے نبی ہیں ہماری طرف سے اللہ سے درخواست کیجئے کہ ہمیں اس سلسلے میں بتائے۔ موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کی طرف متوجہ ہوئے تو اللہ تعالےٰ نے آپ پر وحی بھیجی کہ" اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو"۔ انہیں اس پر بڑی حیرت ہوئی اور کہنے لگے کیا آپ ہم سے ہنسی ۔۔ کرتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، مجھے اللہ اس سے پناہ میں رکھے کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔ وہ بولے کہ پھر ہمارے لئے اپنے رب سے ہماری طرف سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ کیسی ہو۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہو نہ بن بیائی۔ بلکہ دونوں عمروں کے درمیان میں ہو۔ وہ بولے ہماری طرف سے اپنے پروردگار سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ کہا کہ وہ فرماتا ہے کہ گائے خوب گہرے زرد رنگ کی ہو۔ دیکھنے والوں کو خوب بھلی معلوم ہوتی ہو۔ وہ بولے، اپنے پروردگار سے ہماری طرف سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ اور کیسی ہو، اس لئے کہ گائے میں ہمیں اشتباہ پڑ گیا ہے اور اللہ نے چاہا تو ہم ضرور راہ پا جائیں گے۔ کہا کہ اللہ فرماتا ہے کہ وہ گائے محنت کرنے والی نہ ہو کہ جسے محنت نے جھکا دیا ہو، جو زمین کو نہ جوتتی ہو اور نہ کھیتی کو پانی دیتی ہو۔ اس میں کوئی عیب نہ ہو۔ اس پر کوئی داغ دھبہ نہ ہو۔ وہ بولے کہ اب آپ ٹھیک پتہ لائے، پھر انہوں نے اسے ذبح کیا اور وہ ایسا کرتے معلوم نہیں ہوتے تھے"۔ بیان کیا کہ جب انھیں ابتدا میں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا اسی وقت بلاحیل وحجت کے کوئی بھی گائے لاتے اور اسے ذبح کرتے تو مقصد برآری کے لئے کافی ہوتی۔ لیکن انہوں نے خود اپنے اوپر سختی کرنی چاہی تو اللہ تعالےٰ نے بھی گائے کے سلسلے میں سخت قیدیں لگا دیں۔ اور اگر انہوں نے آخر میں اپنی راہ پائی کہ اللہ کی مشیت پر محمول نہ کر دیا ہوتا کہ " اور اگر اللہ نے چاہا تو ہم ضرور راستہ پا جائیں گے"! تو انھیں کبھی راستہ نہ ملتا۔ ہمیں اس سلسلے میں روایت پہنچی ہے کہ ان تمام اوصاف کے ساتھ متصف گائے صرف ایک بڑھیا کے پاس مل سکی جس کی پرورش میں بہت سے یتیم بچے تھے اور وہی گائے ان کی زندگی کا سہارا تھی۔ جب بڑھیا کو معلوم ہوا کہ اس گائے کے سوا اور کوئی گائے وہ ذبح نہیں کر سکتے تو اس نے قیمت بہت بڑھا دی۔ یہودی موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ ان اوصاف والی گائے صرف ایک بڑھیا کے پاس ملی ہے، لیکن وہ اس کی قیمت اصل سے کئی گنا زیادہ مانگ رہی ہے موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ نے تو پہلے تم پر کوئی بار نہیں ڈالا تھا، لیکن تم نے خود ہی یہ قیدیں لگائی ہیں اب مالک کے حسب منشا قیمت دو۔ چنانچہ اتنی ہی قیمت دیکر گائے کو خرید لائے اور اسے ذبح کیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا کہ گائے کی ایک ہڈی لیکر مقتول کے جسم پر اسے ماریں۔ انہوں نے جب ایسا کیا تو مقتول کی روح لوٹ آئی اور اس نے سب کے سامنے قاتل کا نام بتایا اور اس کے بعد پھر مرگیا۔ بنی اسرائیل نے قاتل کو پکڑ لیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کی سب سے پہلے اطلاع دی تھی۔ (تاکہ اس پر شبہ نہ ہو) لیکن اللہ تعالےٰ نے اس کے اس بدترین عمل پر اسے ہلاک کیا۔

سدی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ مقتول کی ایک لڑکی تھی اور اس کے ایک بھتیجے نے جو غریب و نادار تھا اس لڑکی سے نکاح کا پیغام بھیجا۔ لیکن باپ نے جو بہت مالدار تھا انکار کر دیا۔ لڑکے کو اس پر بڑا غصہ آیا اور اس نے قسم کھائی کہ واللہ، میں اپنے چچا کو قتل کر کے رہوں گا۔ اس کا سارا مال لے لوں گا۔ اس کی لڑکی سے نکاح کروں گا اور اس کی دیت بھی خود ہی وصول کروں گا۔ نوجوان اس عہد کے بعد اپنے چچا کے پاس آیا۔ اسوقت کچھ تجارتی قافلے بنی اسرائیل کے بعض قبیلوں میں آئے ہوئے تھے۔ اس نے کہا چچا! میرے ساتھ آپ چلئے۔ اور ان تاجروں سے کچھ سامان مجھے بھی دلوا دیجئے۔ ممکن ہے مجھے اس میں کچھ نفع حاصل ہو جائے، یہ لوگ آپ کو دیکھیں گے تو مجھے سامان دیدیں گے۔ اس طرح نوجوان اپنے بوڑھے چچا کو رات کے وقت لیکر نکلا اور جب اس قبیلہ کے قریب پہنچا تو اسے قتل کر ڈالا اور اپنے گھر واپس آگیا۔ صبح ہوتے ہی خود اپنے چچا کو تلاش کرنے لگا (تاکہ اس پر کوئی شبہ نہ کرے) جیسے اسے معلوم ہی نہیں کہ وہ کہاں ہے

Marfat.com

اس کے گھر معلوم کرنے کے بعد وہ اس قبیلہ کی طرف گیا جہاں اب اس کا چچا مردہ پڑا تھا۔ وہاں تمام لوگ لاش کو گھیرے ہوئے تھے۔ اس نے پہنچتے ہی ان پر الزام تراشی شروع کر دی کہ تمہیں لوگوں نے میرے چچا کو قتل کیا ہے۔ اب تمہیں اس کی دیت دینی پڑے گی۔ وہ رونے پیٹنے اور اپنے سر پر مٹی ڈالنے لگا۔ آخر موسیٰ علیہ السلام کے سامنے معاملہ پیش ہوا تو آپ نے فرمایا کہ (قاعدہ کے مطابق) اسکی دیت تمہیں دینی پڑے گی۔ (کیونکہ مقتول تمہارے محلہ میں پایا گیا ہے اور قاتل کا کوئی پتہ نہیں) انہوں نے عرض کی، یارسول اللہ! آپ اللہ سے دعا کیجئے، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا واقعی قاتل کون ہے، خدا گواہ ہے کہ اس کی دیت (جو مال کی صورت میں ہمیں دینی پڑے گی) کی ادائے گی ہمارے لئے کوئی دشوار نہیں، لیکن ہمیں شرم آتی ہے کہ اس معاملہ پر ہمارے قبیلہ کو غیرت دلائی جایا کرے گی۔ ان کے اس مطالبہ کی طرف اللہ تعالےٰ نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ کیا ہے کہ "اور وہ وقت یاد کرو جب تم نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا تھا، پھر تم آپس میں اس بات پر جھگڑنے لگے اور اللہ کو وہ ظاہر کر دینا تھا جسے تم چھپا رہے تھے"۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا، "تمہیں اللہ حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو"۔ بنی اسرائیل بولے کہ ہم تو آپ سے مقتول کے بارے میں پوچھ رہے ہیں اور یہ کہ اسے کسنے قتل کیا ہے اور آپ ہمیں حکم دے رہے ہیں کہ گائے ذبح کرو۔ آپ ہمارا مذاق تو نہیں بنا رہے۔" قال اعوذ باللہ ان اکون من الجٰھلین،، موسیٰ نے کہا خدا مجھے اس کی پناہ میں رکھے کہ میں جاہلوں میں ہو جاؤں) ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر اس حکم کے بعد بنی اسرائیل کوئی بھی گائے لیتے اور اسے ذبح کرتے تو مقصد برآری کے لئے کافی ہوتی۔ لیکن انہوں نے خود جب قیدیں لگانی شروع کر دیں اور موسیٰ علیہ السلام کو تکلیف پہنچائی تو اللہ تعالےٰ نے بھی ان پر سختی کی۔ ادھر بنی اسرائیل ہی کا ایک شخص اپنے والد کا نہایت فرمانبردار اور اطاعت گذار تھا۔ ایک موقعہ پر کوئی شخص موتی بیچتا ہوا ادھر سے گذرا۔ اس وقت اس کے والد سو رہے تھے اور خزانے کی کنجی ان کے سر کے نیچے تھی۔ تاجر نے اس شخص سے کہا کہ یہ موتی مجھ سے ستر ہزار میں خرید لو۔ نوجوان نے کہا کہ ٹھیک ہے لیکن میرے والد جاگ جائیں تو ان سے کنجی لیکے تمہیں موتی کی قیمت دوں گا، اگر تم تھوڑی دیر کے لئے صبر کر لو تو میں ستر ہزار کے بجائے اسی ہزار دے دوں گا۔ (تاجر کو بھی جلدی تھی) اس نے کہا کہ اگر تم اپنے والد کو ابھی جگا لو تو میں ساٹھ ہزار میں تمہیں موتی دے سکتا ہوں۔ اس طرح تاجر اس کے والد کو فوراً جگانے پر اصرار کرتا رہا اور قیمت گھٹاتا رہا۔ یہانتک کہ اس نے موتی کی قیمت تیس ہزار کر دی۔ لڑکے کا اس پر اصرار تھا کہ جب میرے والد خود سے جاگ جائیں گے اسی وقت میں تم سے موتی لے سکتا ہوں۔ اس کے لئے اس نے قیمت اور بڑھا دی۔ جب تاجر نے بہت اصرار کیا تو اس نے حتمی طور پر کہدیا کہ خدا کی قسم، میں اسوقت تک تمہارے موتی نہیں خرید سکتا جب تک میرے والد خود سے نہ جاگ جائیں۔ اس کا بدلہ اللہ تعالےٰ نے اسے یہ دیا کہ جس طرح کی گائے اب بنی اسرائیل تلاش کر رہے تھے ویسی ہی گائے اس کے یہاں پیدا کر دی تھی۔ جب بنی اسرائیل تلاش کرتے ہوئے ادھر سے گذرے تو دیکھا کہ جس طرح کی گائے انھیں مطلوب ہے وہ اس کے یہاں موجود ہے۔ پہلے تو انہوں نے کہا کہ ایک دوسری گائے لے لو اور یہ گائے ہمیں دیدو۔ لیکن اس نے انکار کیا تو انہوں نے اس کی قیمت دوگنی لگائی پھر اس کے انکار پر دس تک پہنچے اور جب اتنی قیمت پر بھی وہ تیار نہ ہوا تو انہوں نے کہا کہ گائے تو تمہاری بہر حال خریدنی ہے۔ چنانچہ وہ اس شخص کو لیکر موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی یارسول اللہ! گائے اس کے پاس مل گئی ہے اور ہم نے قیمت بھی لگا دی، لیکن یہ دینے سے انکار کر رہا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ بھائی، انہیں گائے دیدو۔ اس نے عرض کی، اے اللہ کے رسول! میں اپنے مال کا سب سے زیادہ حقدار ہوں۔ آپ نے فرمایا، تم نے صحیح کہا اور بنی اسرائیل سے فرمایا کہ اسے خوش کر کے گائے لو۔ چنانچہ وہ اس گائے کے برابر سونا دینے پر تیار ہو گئے، لیکن وہ اس پر بھی راضی نہیں تھا۔ آخر جب انھوں نے گائے کے دس گنا وزن کے برابر سونا دیا تو اسنے گائے بیچی۔ گائے ذبح ہوئی اور پھر قاتل کا پتہ مقتول نے خود ہی بتا دیا۔ مجاہد، وہب، محمد بن کعب قرظی اور محمد بن قیس رحمہم اللہ تعالےٰ سے بھی اسی طرح کی روایتیں منقول ہیں۔ تھوڑا سا اختلاف بھی ہے، مثلاً بعض کہتے ہیں کہ قاتل مقتول کا بھائی تھا، بعض کے خیال میں بھتیجا تھا اور بعض کہتے ہیں کہ وارثوں کی ایک جماعت تھی جو مقتول کے مرنے کا انتظار

Marfat.com

کرتی رہی، لیکن جب بہت دن ہو گئے تو اسے قتل کر ڈالا۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اختصار کے ساتھ مذکورہ بالا روایتوں کے مطابق منقول ہے۔

گائے کیسی ہو؟

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل نے محض موسیٰ علیہ السلام کو تکلیف پہنچانے کے لئے کہا تھا کہ ہماری طرف سے اپنے پروردگار سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ گائے کیسی ہو) "قالوا ادع لنا ربك يبين لنا ما هي" جب انہوں نے خود جہالت اور کج بحثی کا راستہ اختیار کیا اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سوء ظنی کا اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ کا بھی حکم نازل ہوا۔ "قال انه يقول انها بقرة لا فارض ولا بكر عوان بين ذالك فافعلوا ما تؤمرون" (کہا کہ وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہو نہ بن بیائی، بلکہ دونوں عمروں کے درمیان ہو) "لا فارض" یعنی بوڑھی اور عمر رسیدہ نہ ہو۔ بولتے ہیں "فرضت البقرة" یعنی گائے بوڑھی ہو گئی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی روایت ہے کہ "فارض" بوڑھی اور عمر رسیدہ کے معنی میں ہے۔ مجاہد، ابو العالیہ، ربیع قتادہ اور سدی رحمہم اللہ سے بھی یہی معنی اس لفظ کا نقل ہوا ہے۔ "ولا بكر" بکر جانوروں اور انسانوں کے اس مادہ جنس کو کہتے ہیں جس کے قریب ابھی نر نہ گیا ہو۔ دوسرا لفظ اسی سے "بَکر" با کے فتح کے ساتھ آتا ہے، نوجوان اونٹ کو کہتے ہیں۔ آیت میں "لا بكر" سے مراد یہ ہے کہ بالکل کم عمر نہ ہو کہ جس نے ابھی تک بچہ بھی نہ دیا ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے "بکر" کا معنی "کم عمر بچھیا" ہی نقل ہوا ہے۔ مجاہد، قتادہ، ابو العالیہ اور ربیع رحمہم اللہ سے بھی یہی روایت ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے "بکر" کا مفہوم یہ نقل ہوا ہے کہ "جس نے ایک بچہ سے زیادہ نہ دیا ہو"۔ "عوان" یعنی درمیان کی، جو ایک سے زیادہ مرتبہ بیا چکی ہو۔ یہ "بکر" کی صفت نہیں ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ "وہ گائے نہ بوڑھی ہو اور نہ بن بیائی بلکہ ان دونوں کے درمیان میں ہو"۔ "عوان" آیت میں مبتدا ہی بن سکتا ہے، کیونکہ "بين ذالك" سے کنایہ "فارض و بكر" کی طرف ہے لہذا یہ ان پر مقدم نہیں ہو سکتا۔ بولتے ہیں "بَقَرَةٌ عَوَانٌ" اور "بَقَرٌ عُوْنٌ" ایسی لڑائی جس میں ایک سے زیادہ مرتبہ قتل و قتال ہو چکا ہو اس کے لئے "حَرْبٌ عَوَانٌ" بولتے ہیں۔ اسی طرح ایسی عورت جو ایک سے زیادہ مرتبہ بچہ دے چکی ہو اس کے لئے "اِمْرَأَةٌ عَوَانٌ" استعمال ہوتا ہے "حَاجَةٌ عَوَانٌ" ایسی ضرورت کو کہتے ہیں جو کئی بار پوری کی جا چکی ہو۔ چنانچہ یہی تفسیر مجاہد اور سدی رحمۃ اللہ علیہما سے منقول ہے کہ "وہ گائے ان دونوں عمروں کے درمیان ہو اور ایک دو مرتبہ بیائی ہو" ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ابو العالیہ ربیع، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ کی روایات میں بھی یہی ہے کہ "دونوں عمروں کے درمیان ہو" "بين ذالك" یعنی بن بیائی اور بوڑھی کے درمیان ہو۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے اسی طرح تفسیر منقول ہے۔ پس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ موسیٰ نے کہا کہ اللہ فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہو نہ بن بیائی، بلکہ اسے ان دونوں عمروں کے درمیان ہونا چاہیئے یعنی بوڑھی اور نوخیز گائے کے درمیانی عمر کی جس نے ایک سے زیادہ مرتبہ بچہ دیا ہو۔ "فافعلوا ما تؤمرون" پس اب کر ڈالو جو کچھ تمہیں حکم ملا ہے پس اگر تم نے ویسی ہی گائے ذبح کر ڈالی جیسا کہ میں نے تمہیں حکم دیا ہے تو تمہیں مقتول کے قاتل کے متعلق معلوم ہو جائے گا اور تم اپنے مقصد کو حاصل کر لو گے۔×

بال کی کھال

"قالوا ادع لنا ربك يبين لنا ما لونها قال انه يقول انها بقرة صفراء" (وہ بولے ہماری طرف سے اپنے پروردگار سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ اس کا رنگ کیسا ہے، کہا کہ وہ فرماتا ہے کہ گائے خوب گہرے زرد رنگ کی ہو) اب انہوں نے اس گائے کے رنگ کے متعلق سوال شروع کر دیا۔ یہ ان کی کج روی کی دوسری مثال ہے، پہلی ہی مرتبہ بلا کسی سوال کے اگر وہ کوئی بھی گائے ذبح کر لیتے تو مقصد برآری کے لئے کافی تھا۔ لیکن انہوں نے پہلے گائے کے حلیہ کے متعلق سوال کیا اور یہ کہ وہ کیسی ہونی چاہیئے، اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کی کج روی کی سزا کے طور پر ان کے لئے ایک خاص قسم کی گائے کا ذبح کرنا ضروری قرار دے دیا کہ اس کے سوا دوسری کسی قسم کی گائے وہ ذبح نہیں کر سکتے تھے۔ پھر انہوں نے آگے بڑھ کے مزید عناد اور کج روی کا مظاہرہ کیا اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو محض تکلیف پہنچانے کے لئے اس کے رنگ کے متعلق بھی سوال کر ڈالا۔ جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کی اس کج روی ہی کی سزا کے طور پر ان سے کہا گیا کہ "وہ گائے خوب گہرے زرد رنگ کی ہو، دیکھنے والوں کو اچھی معلوم ہوتی ہو" اب انھیں ایک خاص رنگ کی گائے کے

Marfat.com

ذبح کا پابند کر دیا گیا، یعنی جس گائے کے ذبح کرنے کا میں نے تمہیں حکم دیا ہے وہ خوب گہرے زرد رنگ کی ہونی چاہیئے۔ "صفراء" (جسکا ہم نے ترجمہ زرد کیا ہے) کے مفہوم کے سلسلہ میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اس کا مفہوم ہے "خوب گہرے کالے رنگ کی"۔ ایک دوسری روایت میں حسن رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے کہ مراد یہ ہے کہ "اس گائے کی سینگ اور کھُر زرد رنگ کی ہوں" سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے۔ ابن زید اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہما سے مفہوم "زرد رنگ کی" ہی منقول ہے۔ میرا خیال ہے کہ جن حضرات نے "صفراء" سے "کالے رنگ کی گائے" مراد لی ہے ان کے پیش نظر یہ تھا کہ اہل عرب کالے اونٹ کے لئے "ابل صفر" اور کالی اونٹنی کیلئے "ناقۃ صفراء" استعمال کرتے تھے۔ لیکن اس کی ایک اور وجہ بھی کالے اونٹ یا اونٹنیاں ہمیشہ زردی مائل ہوا کرتی ہیں، اس لئے اونٹ ہیں تو یہ چل سکتا ہے، لیکن گائے جسکا رنگ اس طرح کا نہیں ہوتا، اس میں یہ صفت کس طرح چل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ملحوظ رہے کہ عرب "سواد" (کالے) کی صفت کبھی "فقوع" (گہرا) نہیں لاتے، بلکہ اگر سواد (کالے رنگ) کی شدت اور گہرائی کو بیان کرنا ہوتا ہے تو اس کی صفت "حلوکۃ" وغیرہ استعمال کرتے ہیں "اسود حالک" (گہرا سیاہ رنگ) یا اسی مفہوم کے لئے "اسود غربیب" اور "اسود دجوجی" بولتے ہیں۔ "اسود فاقع" کبھی نہیں کہتے۔ البتہ "صفر" (زردی) کی صفت فاقع لاتے ہیں، بولتے ہیں "اَصْفَرُ فَاقِعٌ"۔ اس سے واضح طور پر سمجھا جا سکتا ہے کہ "صفراء" آیت میں زرد رنگ کے لئے استعمال ہوا ہے، اس کا مفہوم سیاہ رنگ بتانا درست نہیں ہے۔ "فاقع لونہا" یعنی گہرا اور خالص زرد رنگ ہو۔ بیاض (سفیدی) میں اگر صفائی اور شدت کو بتانا مقصود ہوگا تو اس کے لئے "نصوع" کا لفظ استعمال کرتے ہیں اسی طرح صفر (زردی) کی شدت و صفائی کے لئے "فقوع" (جس سے فاقع بنا ہے) استعمال ہوتا ہے۔ قتادہ ابو العالیہ، ربیع اور سدی رحمہم اللہ سے یہی روایت ہے کہ مراد یہ ہے کہ "اس کا رنگ کھلا ہو، خالص زرد ہو" ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی فرمایا کہ "خوب گہرا زرد رنگ ہو، ایسا لگے جیسے ابھی سفیدی اس میں سے نکل آئے گی"۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا گہرا زرد رنگ "تسر الناظرین" یعنی یہ گائے اپنے جسم اور ظاہر میں ایسی ہو کہ دیکھنے والے کو خوب اچھی لگے۔ قتادہ اور سدی رحمہما اللہ سے یہی روایت ہے۔ وھب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یعنی دیکھنے میں ایسی لگے جیسے سورج کی شعاعیں اس کی جلد سے پھوٹ پڑیں گی"۔

"قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ" یعنی موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے جنہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا (کہا کہ آپ اپنے پروردگار سے ہماری طرف سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ گائے اور کیسی ہو؟ اس لئے کہ گائے میں ہمیں اشتباہ پڑ گیا ہے اور اللہ نے چاہا تو ہم ضرور راہ پا جائیں گے) یہ ان کی طرف سے تیسری مرتبہ جہالت کا مظاہرہ ہے پہلے گائے کی عمر کے متعلق سوال کیا، اللہ تعالیٰ نے اس کی عمر متعین کر دی۔ اگر اس پر بس کرتے اور اس عمر کی گائے تلاش کر کے ذبح کر دیتے تو ان کا مقصد پورا ہو جاتا۔ لیکن انہوں نے سرکشی سے کام لیا اور رنگ کے متعلق سوال کر بیٹھے اور اب یہ تیسرا سوال ہے۔ اور ان سوالات کے نتیجہ میں اپنے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پابندیوں پر پابندیاں عائد ہو رہی ہیں گائے کے ذبح کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انتہائی سختی محض اُن کے بار بار اس سلسلے میں سوال کرنے اور آپس میں اختلاف کرنے کی وجہ سے کی ہے، اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لئے ارشاد فرمایا ہے کہ "جو کچھ میں تمہارے (عمل کے) لئے چھوڑ رہا ہوں اس سے زیادہ مجھ سے مت پوچھو، کہ تم سے پہلے کی امتیں اپنے نبی سے بار بار (غیر ضروری) سوال اور اپنے نبی کی موجودگی میں اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہو گئیں، پس میں جب کسی چیز کا تمہیں حکم دوں تو اسے بجا لاؤ اور جب کسی چیز سے روکوں تو بلا تامل رک جاؤ، جتنا بھی تم سے ہو سکے۔ بنی اسرائیل نے اپنے نبی موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سوال کر کر کے جتنی تکلیف پہنچائی اُن پر اتنی ہی سختی کر دی گئی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اگر انہوں نے معمولی قسم کی گائے بھی ذبح کر دی ہوتی تو مقصد حاصل ہو جاتا، لیکن انہوں نے سختی کی اس لئے اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر سختی کی۔ عبیدۃ السلمانی اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہما سے بھی یہی روایت ہے،

Marfat.com

مجاہد، ابو العالیہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایتوں میں یہ بھی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر انہوں نے اللہ کی مشیت پر محمول نہ کر دیا ہوتا اور یہ نہ کہا ہوتا کہ "اگر اللہ نے چاہا تو ہم ضرور راہ پا جائیں گے" تو انھیں کبھی راہ نہ ملتی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ اس گائے کی کھال میں بھر کے دینار اس کی قیمت میں دینے پڑے تھے۔

اصول فقہ کا ایک مسئلہ

مختلف اقوال جو صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے مفسرین کے ہم نے نقل کئے ہیں کہ بنی اسرائیل نے ابتدا ہی میں اللہ کے حکم پر کوئی بھی معمولی گائے ذبح کر دی ہوتی تو ان کی مقصد برآری کے لئے کافی ہوتی لیکن جب انہوں نے کھود کرید شروع کر دی تو اللہ تعالےٰ نے بھی ان پر سختی کی۔ ان تمام اقوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اور اپنی کتاب میں انھیں جو بھی حکم دیا تھا اور جس چیز سے بھی روکا تھا، ان سب کے متعلق بنی اسرائیل خوب جانتے اور سمجھتے تھے کہ ان احکام کے ظاہر سے جس طرح کا عام حکم نکلتا ہے وہی اللہ تعالیٰ کا منشا ہے، اس ظاہری حکم کے سوا کوئی اور باطنی اور خاص حکم وہاں اللہ تعالےٰ نہیں دینا چاہتا جبکہ اس ظاہری عموم سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ کو اس میں کس قسم کی تخصیص منظور ہوتی تو وہ خود اپنی کتاب میں یا اپنے رسول کے ذریعہ اس کی وضاحت کر دیتا اور پھر کتاب اللہ یا رسول اللہ..... صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اگر کوئی ایسا حکم، خاص کر دیا جاتا ہے جو اس سے پہلے کی آیت میں بظاہر عام معلوم ہوتا تھا تو صرف یہ خاص حکم ہی اس عموم سے الگ سمجھا جاتا ہے جبکا خصوص خود کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ کے ذریعہ معلوم ہوا تھا۔ اس کے بعد آیت جس طرح پہلے عام تھی، اس خاص حکم کے نکل جانے کے بعد اس کا عموم اب بھی باقی رہتا ہے اور اس خاص کے سوا کوئی اور چیز اس عموم سے اپنی طرف سے کوئی شخص نہیں نکال سکتا۔ ہم نے اس فقہی اصل کی وضاحت اپنی کتاب "کتاب الرسالۃ من لطیف القول فی البیان عن اصول الاحکام" کے "عموم وخصوص" کی بحث میں کر دی ہے۔ ہم نے جو فقہی اصل ذکر کی ہے اس کی دلیل اس آیت سے متعلق ان مختلف اقوال سے ملتی ہے جو ہم ابھی بیان کر چکے ہیں..... کیونکہ ان اقوال سے واضح طور پر سمجھ میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل کی سب سے بڑی غلطی اور نافرمانی یہی تھی کہ انہوں نے جان بوجھ کر رسول اللہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سوال کیا اور اللہ تعالےٰ نے انہیں جو حکم عموم کے ساتھ دیا تھا اس میں تخصیص کے لئے کھود کرید کرنے لگے۔ ان اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے سوال نہ کیا ہوتا اور جو حکم ابتدا میں اللہ تعالےٰ نے انھیں دیا تھا، اسی پر پوری فرمانبرداری اور طاعت کے ساتھ عمل کیا ہوتا تو کوئی بھی ایسا جانور جسے "گائے" کہا جا سکتا ہو پکڑ کر ذبح کر سکتے تھے اور اس سے ان کا مقصد حاصل ہو جاتا۔ لیکن انہوں نے اللہ تعالےٰ کے عام حکم کے باوجود سوال کیا کہ وہ گائے کیسی ہو؟ اس پر اللہ تعالےٰ نے ایک اور قید بڑھا دی کہ "وہ گائے نہ بوڑھی ہو اور نہ بن بیائی، بلکہ دونوں عمروں کے درمیان ہو"۔ اب ان کے لئے ضروری تھا کہ اس شرط کے مطابق کوئی ایسی گائے تلاش کرتے جو نہ بوڑھی ہوتی اور نہ بن بیائی، بلکہ دونوں عمروں کے درمیان عمر کی ہوتی اگر انہوں نے اس شرط کے بعد اسی کے مطابق کوئی گائے تلاش کر کے ذبح کر دی ہوتی تو اس سے ان کا مقصد حاصل ہو جاتا، لیکن انہوں نے اس پر بھی اکتفا نہیں کیا اور سوال کر بیٹھے کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟

اللہ تعالےٰ نے مخصوص رنگ کی بھی پابندی لگا دی اور اب ان کے لئے ضروری ہو گیا کہ اسی خاص رنگ کی گائے ذبح کریں ان تمام اقوال میں جو ہم نے اس سلسلے میں بیان کیا کہیں یہ موجود نہیں ہے کہ ان کے ایک مرتبہ سوال کرنے کے بعد جب اللہ تعالےٰ نے عام حکم کو چند شرائط کے ساتھ خاص کر دیا تھا تو وہ عام حکم بھی عام باقی نہیں رہا تھا۔ بلکہ خاص ہو گیا تھا۔ پس ان اقوال کا اس سلسلے میں اتفاق اور سب سے بڑھکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث جو ہم نے نقل کی ہے ان سب سے وہی اصل صاف طور پر سمجھ میں آتی ہے جو "عموم وخصوص" کے باب میں ہم نے بیان کی کہ جب بھی کوئی حکم اللہ کی کتاب میں "عموم" کے ساتھ ذکر ہو گا تو اس سے عام حکم ہی مراد ہو گا۔ البتہ اگر کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ سے اس بظاہر عام حکم میں کوئی تخصیص سمجھ میں آئے تو عام حکم پھر بھی عام ہی رہتا ہے، البتہ اس سے عام حکم کی وہ چند صورتیں ضرور نکل جاتی ہیں جس کے بارے میں خود کتاب اللہ

Marfat.com

یا سنت نے فیصلہ کر دیا ہے۔[1] بعض جاہلوں کا خیال ہے کہ گائے ذبح کرنے کا جب انھیں حکم ہوا تو بنی اسرائیل نے سمجھا کہ انھیں کسی خاص قسم کی گائے ذبح کرنا ضروری ہے اور اس لئے انہوں نے یہ سوالات کئے۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالے ان کے لئے تنگی اور سختی نہ کرتا، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ان کے خیال میں اللہ تعالے کوئی فرض حکم نازل کر دے اور اس کی عبادت کا حکم بھی دے، لیکن اس حکم کی کوئی وضاحت نہ کرے۔ یہ ایک خلاف واقعہ بات ہے اور وہی لوگ ایسی باتیں کر سکتے ہیں جو فہم و عقل سے بہت دور ہوں گے آیت میں "البقر" "بقرۃ" کی جمع ہے (بمعنی گائے) بعض قراءتوں میں (ان البقر کے بجائے) "ان الباقر" آیا ہے۔ اگرچہ یہ لفظ بھی کلام عرب میں اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن چونکہ مشہور و متداول قراءت کے خلاف ہے۔ اس لئے یہ قراءت جائز نہ ہوگی۔ "تَشَابَہَ عَلَیْنَا" کا مطلب ہے "ہمیں التباس و اشتباہ ہوگیا ہے" اس کی بھی قراءتیں مختلف نقل ہوئی ہیں، اور میرے نزدیک صحیح مشہور و معروف قراءت "تَشَابَہَ" شین کی تخفیف اور ہا کے زبر کے ساتھ ہے) کیونکہ تمام قابل اعتماد قراءتیں اسی کے مطابق نقل ہوئی ہیں۔ "وانا انشاء اللہ لمھتدون" یعنی گائے کے سلسلے میں جو التباس اور اشتباہ ہوگیا ہے، اگر اللہ نے چاہا تو وہ ہمارے لئے اس معاملہ کو واضح کر دے گا۔ "الاھتداء" کا مفہوم اس آیت میں واضح کرنا اور کھولنا ہے۔

تیسری شرط "قَالَ اِنَّہٗ یَقُوْلُ اِنَّھَا بَقَرَۃٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِیْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِی الْحَرْثَ" (کہاکہ وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے محنت کرنے والی نہ ہو جو زمین کو جوتتی ہو اور نہ کھیتی کو پانی دیتی ہو) مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالے فرماتا ہے کہ جس گائے کو ذبح کرنے کا میں نے تمہیں حکم دیا ہے وہ محنت کرنے والی نہ ہو یعنی ایسی نہ ہو کہ کام نے اسے تھکا دیا ہو۔ اس طرح آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ایسی گائے ہو جس سے کھیت جوتنے کا کام نہ لیا گیا ہو اور نہ اس سے کھیتی کو پانی دینے کا کام لیا گیا ہو۔[2] ایسے جانور کو جس سے سواری یا دوسرے کام خوب لئے جاتے ہوں "دَابَّۃٌ ذَلُوْلٌ" کہتے ہیں۔ "رَجُلٌ ذَلِیْلٌ" (معمولی کام کاج والا شخص) بھی اسی سے ہے۔ "انھا بقرۃ لا ذلول" کا مفہوم قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ نقل ہوا ہے کہ وہ مضبوط ہو، کام کاج نے اسے تھکا نہ دیا ہو، وہ نہ زمین جوتتی ہو اور نہ کھیتی میں پانی دیتی ہو، ربیع مجاہد، سدی اور ابو العالیہ رحمہم اللہ سے بھی یہی روایت ہے۔ اللہ تعالے نے اس کی یہ صفات اس لئے بیان کیں کہ جیساکہ بیان کیا گیا ہے وہ گائے وحشی اور جنگلی قسم کی تھی۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت ہے۔ "مُسَلَّمَۃٌ" سلامۃ سے نکلا ہے یعنی محفوظ ہو۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ وہ داغ دھبے سے محفوظ ہو، نہ اس پر سفید داغ ہوں اور نہ سیاہ۔

بعض دوسرے مفسرین نے فرمایا ہے کہ عیوب سے محفوظ رہنا مراد لیا گیا ہے۔ قتادہ، ابو العالیہ اور ربیع رحمہم اللہ سے یہ روایت ہے کہ اس میں کوئی عیب نہ ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی روایت ہے۔ اور یہی قول زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ اگر "مسلمۃ" کا مطلب یہ ہوتا کہ داغ دھبے سے محفوظ ہو تو پھر اس کے بعد فوراً ہی "لا شیۃ فیھا" نہ آتا کیونکہ اس کا بھی یہی مفہوم ہے۔ اسلئے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ گائے ایسی ہو کہ نہ محنت کرنے والی ہو جو زمین کو جوتتی ہو اور نہ کھیتی کو پانی دینے والی ہو اور اس کے ساتھ

---

[1] قرآن مجید کی مذکورہ بالا جس آیت سے ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ کی اس اصل کا استنباط کیا ہے، قطعاً کسی طرح بھی یہ اصل اس آیت سے یا ان اقوال سے جو آیت کی تفسیر میں نقل ہوئے ہیں، سمجھ میں نہیں آتی۔ بنی اسرائیل نے سرکشی اور نافرمانی کی اللہ کے رسول کو تکلیف دینی چاہی اور اس کی انھیں سزا ملی۔ یہ ہے آیت کا حاصل! عموم و خصوص کی بحث کا اس سے کیا تعلق! البتہ ضمناً اس آیت سے کوئی مسئلہ نکلتا ہو تو یہ دوسری بات ہے، فقہ کے اتنے اہم اصل کی بنیاد اس پر نہیں رکھی جاسکتی۔ امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت غیر واضح ہے۔ یہ اصل ائمہ فقہ کے یہاں مختلف فیہ بھی ہے جس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ (مترجم)

[2] ہندوستان میں کھیت جوتنے اور پانی دینے کا کام صرف بیلوں سے لیا جاتا ہے، گائے سے نہیں لیا جاتا ہے۔ لیکن دوسرے ممالک میں یہ کام گائے سے بھی لیا جاتا ہے (مترجم)

Marfat.com

اس میں کوئی عیب بھی نہ ہو۔" لا شیۃ فیہا" یعنی اس کے چمڑے کے اصلی رنگ کے سوا اس پر کوئی اور دھبہ اور داغ نہ ہو۔" وَشَیَ الثَّوْبَ" سے نکلا ہے کپڑے کو خوبصورت بنانے کے لئے مختلف رنگوں کے دھاگے بنتے وقت تانے بانے میں استعمال کرنے کیلئے بولتے ہیں۔ بادشاہ یا کسی حاکم وغیرہ کے پاس اگر کوئی کسی کا سفارشی بن کر جائے اور اس کی خوب تعریفیں کرے تو اس کے لئے "وَاشٍ" کا لفظ استعمال کرتے ہیں کیونکہ وہ بھی جھوٹ سچ ہر طرح اسے اچھا اور قابل تعریف ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ عربی لغت کے بعض علماء کا خیال ہے کہ "وَشْیٌ" علامت اور نشانی کے معنی میں آتا ہے اس کے "واو" کو حذف کر کے آخر میں "تا" بڑھا دی گئی ہے اور اس طرح "وشی" سے "شیۃ" ہو گیا ہے عربی میں اس طرح تبدیلی اس وزن پر بکثرت ہوتی ہے۔ اس لفظ کا جو مفہوم ہم نے بیان کیا ہے وہی دوسرے اکابر مفسرین سے بھی منقول ہے۔ قتادہ، ربیع اور ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہم سے روایت ہے کہ "لَا شِیَۃَ فِیْہَا" یعنی اس میں سفیدی نہ ہو، مجاہد اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہما نے فرمایا کہ اس میں نہ سفیدی ہو نہ سیاہی عطیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اصلی رنگ کے سوا کوئی دوسرا رنگ اس میں نہ ہو۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ نہ اس میں سفیدی ہو نہ سیاہی اور نہ سرخی۔

"قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ"۔ اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں بھی مختلف اقوال نقل ہوئے ہیں، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ "وہ بولے اب آپ نے حق بات صاف صاف بیان کی ہے" اور عبدالرحمٰن بن زید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قوم کی ذہنیت کی اطلاع دی ہے یعنی انہوں نے اللہ کے نبی موسیٰ علیہ السلام پر یہ الزام لگایا کہ گائے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے جو آپ کو حکم دیا تھا وہ آپ صاف طریقے سے نہیں بیان کر رہے تھے، لیکن اب آپ نے ٹھیک ٹھیک بات بتا دی۔ ہمارے نزدیک دونوں میں زیادہ مناسب تفسیر وہ ہے جو قتادہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اکابر مفسرین سے منقول ہے، یعنی یہ کہ انہوں نے کہا اب گائے کے سلسلے میں آپ نے حق بات صاف صاف بیان کر دی ہے اور اب ہم سمجھ گئے کہ کس طرح کی گائے ہمیں ذبح کرنی چاہیئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق یہ بتایا ہے کہ آخر میں انہوں نے گائے ذبح کی تھی اور موسیٰ علیہ السلام کا حکم، اس کے باوجود کہ پوری شرائط کے ساتھ اسے انجام دینا انتہائی دشوار ہو گیا تھا اور اس کی قیمت بھی انھیں بہت دینی پڑی تھی۔ لیکن بہرحال انہوں نے اسے تمام شرائط کے ساتھ انجام دیا تھا۔ چنانچہ اس آیت کے بعد ہے کہ "فَذَبَحُوْہَا وَمَا کَادُوْا یَفْعَلُوْنَ" (پھر انہوں نے اسے ذبح کیا اور وہ ایسا کرتے معلوم نہیں ہوتے تھے) پس اگر "اَلْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ" (اب آپ نے حق بات صاف صاف بتا دی) بھی انہوں نے محض ہٹ دھرمی عناد اور جہالت کی وجہ سے کہا تھا تو یہ آیت کی ان تفصیلات کے خلاف ہوگا جس میں بیان کیا گیا ہے کہ گائے کے سلسلے میں وہ سوالات کرتے رہے تھے اور موسیٰ علیہ السلام اس کے جوابات انھیں دیتے رہے تھے اور بالآخر انہوں نے موسیٰ علیہ السلام ہی کے حکم کے مطابق گائے ذبح کی پس ان لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ ان لوگوں نے "اَلْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ" کہہ کے اس کا اظہار کیا تھا کہ اب تک آپ حق کو چھپاتے رہے تھے اور یہ ان کا کفر اور اپنے دین سے ارتداد تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو اسکے فوراً ہی بعد اطلاع دی ہے کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کا حکم مان لیا اور گائے ذبح کی۔ "فَذَبَحُوْہَا وَمَا کَادُوْا یَفْعَلُوْنَ" یعنی پھر موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے اس گائے کو ذبح کیا جسے اللہ تعالیٰ نے انھیں بہت سی شرائط کے ساتھ ذبح کرنے کا حکم دیا تھا۔ "وَمَا کَادُوْا یَفْعَلُوْنَ" یعنی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ذبح نہیں کریں گے اور اس سلسلے میں اللہ کے فرض کو چھوڑ دیں گے۔ مفسرین کے اس سلسلے میں کئی اقوال ہیں کہ آخر کیوں وہ گائے کو ذبح کرتے نہیں معلوم ہوتے تھے؟ محمد بن کعب قرظی اور محمد بن قیس رحمۃ اللہ علیہما سے روایت ہے کہ کیوں کہ اس کی قیمت بہت زیادہ تھی اس لئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اللہ کے فرض کو چھوڑ دیں گے اور ذبح نہیں کریں گے، گائے والوں نے اس کے چمڑے میں بھر کر سونا اس کی قیمت کے طور پر مانگا تھا جو مقتول کے مال سے انھیں دینا ہوتا، لیکن آخر الامر انہوں نے ذبح کر ہی دیا۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ رسوائی اور بدنامی کے خیال سے وہ ذبح کرنا نہیں چاہتے تھے کہ جس مقتول کے قاتل کے بارے میں انہوں نے آپس میں جھگڑا کیا تھا، اللہ تعالیٰ اس طرح اسے ضرور ظاہر کر دے گا، ہمارے نزدیک دونوں ہی تفسیریں صحیح ہیں۔ قیمت زیادہ ہونے کی وجہ سے بھی وہ بھاگنا چاہتے تھے۔ اور اس کا خوف دامن گیر تھا کہ اس طرح تو حقیقت حال بالکل کھل جائے گی اور قاتل کو سب جان

Marfat.com

لیں گے۔

قیمت ایک گائے کی

اس کی غیر معمولی قیمت کے سلسلے میں کئی روایتیں ہیں۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ گائے انہوں نے اس کے دس گنا وزن کے برابر سونے کے بدلہ میں خریدی تھی۔ عبیدہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اس کی کھال میں دینار بھر کر اس کی قیمت کے طور پر انہیں دینا پڑا تھا۔ مجاہد اور ابن وھب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ گائے انہیں ایک ایسے شخص کے پاس ملی جو اسے کسی قیمت پر بھی بیچنا نہیں چاہتا تھا، لیکن بنی اسرائیل خریدنے پر مسلسل اصرار کرتے رہے، آخر یہ طے پایا کہ کھال اتارنے کے بعد اس کی کھال میں دینار بھر کر اس کی قیمت کے طور پر دیں گے۔ اب وہ بیچنے پر تیار ہوا۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ان صفات کی گائے صرف ایک بڑھیا کے پاس مل سکی اور اس نے ان سے کئی گنا قیمت مانگی۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی بنی اسرائیل سے کہا کہ اس کی مرضی کے مطابق قیمت دے کے خرید لو۔ آخر گائے خریدی گئی اور ذبح کی گئی۔ گائے کی اصل اور واقعی قیمت بہت کم تھی، چنانچہ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اس کی قیمت تین دینار سے زیادہ نہیں تھی۔ انھیں اس کا بھی خوف تھا کہ اگر انہوں نے گائے ذبح کر دی تو قاتل کا علم سب کو ہو جائے گا اور اس میں بڑی رسوائی ہوگی۔ وھب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا، کیا آپ ہم سے ہنسی کر رہے ہیں؟ کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ اگر گائے ذبح ہوئی تو اُن کی رسوائی ہوگی، اس لئے ذبح کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آخر میں جب اللہ تعالےٰ نے مقتول کو زندہ کر دیا اور اس نے اپنے قاتل کے متعلق بتا دیا تو بنی اسرائیل (کے وہ افراد جو قتل میں شریک تھے) انکار کرنے لگے اور کہنے لگے کہ خدا کی قسم ہم نے اسے قتل نہیں کیا ہے،

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝

(اور) ذرا وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں (میں سے کسی) نے ایک آدمی کا خون کر دیا پھر ایک دوسرے پر اسکو ڈالنے لگے اور اللہ تعالیٰ کو اس امر کا ظاہر کرنا منظور تھا جسکو تم مخفی رکھنا چاہتے تھے۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

اس لئے ہم نے حکم دیا کہ اس کو اس (بقرہ) کے کوئی سے ٹکڑے سے چھوا دو۔ اسی طرح حق تعالیٰ (قیامت میں) مردوں کو زندہ کر دینگے اور اللہ تعالیٰ اپنے نظائر (قدرت) تم کو دکھلاتے ہیں اسی توقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو

اللہ کی قدرت کے مظاہر

"وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا" (اور اے بنی اسرائیل! وہ وقت یاد کرو جب تم نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا تھا، پھر تم آپس میں اس باب میں جھگڑنے لگے) "نفس" (شخص) جس کے قتل کے متعلق اس آیت میں بتایا گیا ہے۔ یہ وہی واقعہ ہے جس کی تفصیل ابھی گذر چکی ہے اور جس کے متعلق آیت میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا تاکہ قاتل کا پتہ چلے "ادّٰرَأْتُمْ" یعنی اختلاف اور جھگڑا کیا۔ یہ دَرَأَ سے نکلا ہے۔ جس کا اصل معنی "لوٹنا" ہے۔ "اِدّٰرَأْتُمْ" کا جو مفہوم ہم نے بیان کیا وہ یہ معنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ایک حدیث میں بھی مراد لئے گئے ہیں۔ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ امیہ کے صاحبزادے عثمان اور زھیر رضی اللہ عنہما میرے پاس آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میرے لئے آپ کی خدمت میں حاضری کی اجازت چاہی، آنحضور نے اس پر فرمایا کہ میں اسے تم لوگوں سے بھی زیادہ جانتا ہوں (اور مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا) کیا تم جاہلیت کے زمانہ میں میرے شریک نہیں تھے؟ میں نے عرض کی ہاں میرے ماں باپ آنحضور پر فدا ہوں

Marfat.com

آنحضورؐ کتنے اچھے شریک تھے "کُنْتَ لَا تُمَارِیْ وَلَا تُدَارِیْ" (نہ آپ نے کبھی کوئی جھگڑے کی بات کی اور نہ کبھی کوئی اختلاف کیا) "فادارءتم" اصل میں "فتدارءتم" تھا، چونکہ "تا" اور "دال" کا مخرج قریب ہے۔ اس لئے تا کو بھی دال پڑھا جانے لگا، تاکہ ادائیگی میں سہولت رہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ "فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا" کا مطلب یہ ہے کہ تم نے قتل کے معاملہ میں اپنی طرف سے مدافعت کی (اور ہر شخص نے کہا کہ میں نے قتل نہیں کیا ہے) بولتے ہیں "دَرَءْتُ هٰذَا الْاَمْرَ عَنِّیْ" (اس معاملہ کو میں نے اپنے اوپر سے ہٹا دیا) اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے "وَیَدْرَءُ عَنْهَا الْعَذَابَ" (اور اس (عورت) سے سزا اس طرح ٹل سکتی ہے) مفہوم کے اعتبار سے یہ قول بھی پہلے قول سے قریب ہے، کیونکہ بنی اسرائیل کے ہر فرد نے قتل کے سلسلے میں اپنی طرف سے مدافعت کی تھی اور کہا تھا کہ میں نے قتل نہیں کیا ہے، جیسا کہ ہم اس سے پہلے تفصیل سے واقعات لکھ آئے ہیں۔ مجاہد، ابن جریج اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہم کو وہی تفسیر منقول ہے جو ہم نے بیان کی کہ "قتل کے بارے میں وہ باہم جھگڑنے لگے اور ہر فریق اپنی برات اور دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرانے لگا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح کی روایت منقول ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایک بوڑھا شخص بڑا صاحب مال و دولت تھا۔ اس کے کئی بھتیجے تھے جو بالکل محتاج اور غریب تھے۔ لیکن مالدار بوڑھا لاولد تھا۔ اس کے بھتیجے انتظار کرتے رہے کہ ہمارا چچا کب مرتا ہے تاکہ اس کا سارا مال ہمیں ملجائے، لیکن بہت دن ہوگئے اور اس کی موت نہیں ہوئی تو شیطان نے انھیں بہکایا کہ تم اپنے چچا کو قتل کیوں نہیں کردیتے۔ اس کا سارا مال تمہیں جلدی سے ملجائے گا، قتل کی ذمہ داری دوسری بستی والوں پر ڈالدینا اور ان سے بھی دیت وصول کرنا۔ وہاں پر آبادی بنی اسرائیل کی دو بستیاں تھیں اور یہ انہیں سے ایک بستی میں رہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے قتل کیا اور دوسری بستی کے شہر پناہ کے دروازے پر لیجا کر لاش ڈال دی۔ صبح ہوئی تو اس بوڑھے کے قاتل اس کے بھتیجے ہی اس بستی میں سب سے پہلے پہنچے اور کہنے لگے کہ ہمارے چچا کو تمہیں نے قتل کیا ہے، تمہیں اس کی دیت (بدلہ مال کی صورت میں) دینی پڑے گی۔ بستی والے قسم کھانے لگے کہ خدا گواہ ہے ہم نے نہ تو قتل کیا ہے اور نہ اس کے قاتل کو جانتے، رات میں دروازہ بند کرنے کے بعد پھر صرف اس وقت کھولا گیا ہے۔ درمیان کے کسی وقفہ میں ہم نے دروازہ بھی نہیں کھولا تھا۔ آخر جبرئیل علیہ السلام اللہ سمیع وعلیم کا حکم موسیٰ علیہ السلام کے پاس لائے اور کہا کہ آپ ان سے کہیئے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو اور اس کے جسم پر اس کے گوشت کا ٹکڑا مارو۔ محمد بن کعب قرظی اور محمد بن قیس رحمۃ اللہ علیہما سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت نے جب دیکھا کہ لوگوں میں برائیاں بہت پیدا ہوگئی ہیں تو انہوں نے اپنی ایک الگ بستی آباد کرلی اور نافرمان اور برے لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ ان کا معمول تھا کہ جب شام ہوتی تو ان کی بستی کا جو شخص بھی باہر ہوتا اسے بستی میں بلالیتے (اور دروازہ بند کردیتے) اسی طرح جب صبح ہوتی تو اس بستی کا رئیس دیوار کے اوپر سے جھانکر باہر کی طرف اچھی طرح دیکھتا، جب کوئی خاص چیز نظر نہ آتی تو دروازہ کھولتا لیکن ایک دن جب اس نے خوب غور سے ہر چیز ملاحظہ کرنے کے بعد دروازہ کھولا تو دروازے سے لگی ہوئی ایک مقتول شخص کی لاش پڑی تھی مقتول کا بھتیجا اور اس کے ساتھی اور حامی چلانے اور شور کرنے لگے کہ تمہیں لوگوں نے اسے قتل کیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا یہ اصول تھا کہ جب بنی اسرائیل میں آپس ہی میں ایک دوسرے کو قتل کرنے کا مرض زیادہ بڑھ جاتا تو آپ مقتول کو جس محلہ میں پاتے اسی محلہ والوں کو پکڑتے اس بستی والوں اور مقتول کے بھتیجوں اور ان کے حامیوں میں بات اتنی بڑھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ آپس میں قتل وخونریزی ہوجائے گی۔ دونوں فریق ہتھیار لیکر بھی پہنچ گئے تھے۔ لیکن کچھ لوگوں نے بیچ بچاؤ کردیا اور معاملہ موسیٰ السلام کی پاس پہنچا۔ مقتول کی طرف سے آئے ہوئے لوگوں نے (جو خود قتل کے ذمہ دار تھے) کہا کہ اس بستی والوں نے قتل کیا اور پھر لاش اپنے دروازے کے باہر ڈالدی۔ بستی والوں نے کہا کہ یارسول اللہ! آپ خود واقف ہیں کہ ہم نے ان کی برائیوں سے کنارہ کش ہونے کیلئے ایک الگ بستی بنالی تھی، ہم نے نہ تو کوئی قتل کیا ہے اور نہ اس کے متعلق ہمیں کوئی علم ہے۔ پھر اللہ تعالےٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو وحی کے ذریعہ گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ عبیدہ اور ابن زید رحمہما اللہ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ ان روایات سے معلوم ہوا کہ وہ اختلاف ونزاع جو مقتول کے سلسلہ میں انہیں ہوا تھا اسی کے متعلق اللہ تعالےٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود مدینہ کے یہودیوں کو مخاطب کرکے فرمایا ہے کہ "پھر تم آپس میں جھگڑنے لگے اور

Marfat.com

اللہ کو وہ ظاہر کر دینا تھا جسے تم چھپا رہے تھے"

"وَاللّٰہُ مُخْرِجٌ مَّا کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ" یعنی مقتول کو تم نے خود قتل کیا پھر آپس ہی میں جھگڑنے لگے لیکن اللہ کو تو ظاہر کر دینا تھا اور اعلان کر دینا تھا اس کا جسے تم چھپا رہے تھے۔ "اِخْرَاج" (جس سے مُخْرِجٌ بنا ہے) اور یہاں چھپی ہوئی اور پوشیدہ چیز کے اظہار اور اعلان کے معنی میں ہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد "اَلَّا یَسْجُدُوْا لِلّٰہِ الَّذِیْ یُخْرِجُ الْخَبْءَ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (یعنی اللہ کی عبادت نہیں کرتے جو باہر لاتا ہے، آسمان اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو) میں بھی یُخْرِجُ کا مطلب یُظْهِرُ ہے یعنی ظاہر کرتا ہے۔ جس چیز کو بنی اسرائیل چھپا رہے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ظاہر کر دیا وہ مقتول کا قاتل تھا۔ قاتل اور اس کے ساتھی اصل واقعہ کو چھپانا چاہتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے ظاہر کر دیا اور حقیقت حال سب کو معلوم ہو گئی۔ "تَکْتُمُوْنَ" یعنی تم چھپاتے تھے، راز رکھنا چاہتے تھے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے "تکتمون" کی یہی تفسیر نقل ہوئی ہے" فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا" یعنی ہم نے موسیٰ کی قوم سے جنہوں نے مقتول کے بارے میں آپس میں جھگڑا کیا تھا، کہا کہ مقتول پر اس گائے کا کوئی ٹکڑا مارو جس کے ذبح کرنے کا اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے اور حکم کے مطابق تم نے ذبح بھی کر دیا ہے۔ مفسرین کے اس سلسلہ میں کئی اقوال ہیں کہ مقتول پر گائے کے جس ٹکڑے کو مارنے کا حکم دیا گیا تھا وہ اس کے جسم کا کونسا حصہ تھا۔ مجاہد، عکرمہ اور قتادہ رحمہم اللہ نے فرمایا کہ گائے کی ران کو مقتول پر مارنے کا حکم ہوا تھا جب انہوں نے حکم کے مطابق مارا تو اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ کر دیا اور اس نے خود بتایا کہ فلاں نے مجھے قتل کیا ہے، اور اس کے بعد پھر اس کی روح قبض ہو گئی۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ گائے کے دونوں مونڈھوں کے درمیان کے حصہ کو مقتول پر مارا گیا تھا، پھر وہ زندہ ہو گیا تو اس سے لوگوں نے پوچھا کہ تمہیں کس نے قتل کیا ہے؟ اس نے کہا کہ میرے بھتیجے نے۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ گائے کی کوئی ہڈی مقتول پر مارنے کا حکم ہوا تھا۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ گائے کے سرین کا حصہ مقتول پر مارا گیا تھا۔ عبیدہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ گائے کے گوشت کا کوئی ٹکڑا اس پر مارا گیا تھا ان تمام اقوال کی روشنی میں ہمارے نزدیک بہتر تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد " فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا" میں صرف اتنا کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو یہ حکم دیا تھا کہ مقتول پر گائے کا کوئی ٹکڑا مارو تا کہ وہ زندہ ہو جائے۔ نہ آیت میں اس طرف کوئی اشارہ ہے اور نہ حدیث صحیح میں واقعہ کی کوئی ایسی تفصیل موجود ہے جس کی روشنی میں تعین کیا جا سکے کہ گائے کے کس حصہ کو مقتول پر مارنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے انھیں دیا تھا۔ ممکن ہے وہ حصہ مونڈھے کا ہی ہو، ممکن ہے اس کے بجائے پونچھ کے مارنے کا حکم انھیں ہوا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ران کے حصہ کو یا اس کے جسم کے کسی بھی خاص حصہ کو مارنے کا حکم ہوا ہو۔ اور اگر ہمیں اس کا کوئی علم نہ ہو کہ گائے کے کس خاص حصہ کو مقتول پر مارنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا تو اس سے ہمیں کوئی نقصان نہیں ہو گا اور اگر کسی ذریعہ سے ہمیں اس کا علم حاصل ہو جائے تو اس سے کوئی فائدہ بھی نہیں۔ اتنی بات تو بہر حال ہمیں ماننی ہی ہے کہ بنی اسرائیل نے مقتول کے جسم پر گائے کا کوئی حصہ مارا تھا اور پھر اللہ تعالیٰ نے مقتول کو زندہ کر دیا تھا۔ ذبح کی ہوئی گائے کے بعض حصہ کو مقتول کے جسم پر مارنے کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام اور آپس میں جھگڑنے والے بنی اسرائیل کو قاتل کا پتہ خود مقتول کی زبانی بتا دے اس طرح پوری تفصیل آیت میں ذکر نہیں ہے، لیکن آیت کی ترتیب سے خود سمجھ میں آتا ہے کہ گائے کو ذبح کرنے اور پھر اس کے جسم کے کسی حصہ کو مقتول پر مارنے کا مقصد یہی تھا۔ اس لئے آیت کا مفہوم یوں ہو گا کہ" پھر ہم نے کہا کہ مقتول پر گائے کا کوئی ٹکڑا مارو، تا کہ اللہ تعالیٰ اسے زندہ کر دے۔ انہوں نے اسی طرح مارا تو اللہ تعالیٰ نے مقتول کو زندہ کر دیا اس طرح حذف و اختصار قرآن مجید میں اکثر ہوا ہے (اور گفتگو اور تحریر وغیرہ میں یہ ایک عام و معروف طریقہ ہے)

سبق

"کَذٰلِکَ یُحْیِ اللّٰہُ الْمَوْتٰی" (یوں ہی اللہ مردوں کو زندہ کرے گا) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو خطاب کیا ہے اور مشرکین جو حشر و نشر کے منکر ہیں انھیں بھی قائل کیا ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک مردہ کو اللہ تعالیٰ نے اسی دنیا میں زندہ کیا، اس سے تمہیں عبرت حاصل کرنی چاہیئے اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا ہے کہ اسے موت کے بعد

Marfat.com

حشر و نشر کا انکار کرنے والو! اس مقتول کے دوبارہ زندہ ہو جانے سے عبرت حاصل کرو، کیونکہ جس طرح میں نے دنیا میں اسے زندہ کر دیا تھا اسی طرح تمام مردوں کو دوبارہ زندہ کروں گا اور قیامت کے دن انھیں جمع کروں گا۔ اس آیت کے سب سے پہلے مخاطب مشرکین عرب تھے، جو ایک ناخواندہ قوم تھی اور اُن کے پاس کوئی آسمانی کتاب بھی نہیں تھی۔ انھیں اس طرح کا جو بھی علم تھا وہ انھیں یہودیوں کے واسطے سے تھا جو عرب میں رہتے تھے۔ یہ آیت انھیں کے اسلاف کے ایک واقعہ کو بیان کرتی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے مشرکین عرب کو بھی خطاب کیا تاکہ وہ اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں جو ان سے بہت پہلے ایک قوم میں ہو چکا تھا اور اپنے عقیدوں پر نظر ثانی کریں "وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ" (اور وہ تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو) یعنی اے اللہ تعالیٰ کا انکار کرنے والو اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو جھٹلانے والو! اللہ تمہیں اپنی نشانیاں اور وہ دلائل و شواہد دکھاتا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو ثابت کرتی ہیں، تاکہ تمہیں عقل آئے اور تم سمجھ سکو کہ واقعی آنحضورؐ سچے اور حق پر ہیں اور ان پر ایمان ضروری ہے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ۗ وَإِنَّ مِنَ

کام لیا کرو ایسے ایسے واقعات کے بعد تمہارے دل پھر بھی سخت ہی رہے تو یوں کہنا چاہیے کہ) اُنکی مثال پتھر کی سی ہے بلکہ سختی میں (پتھر سے بھی زیادہ سخت بعضے پتھر تو

الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا

ایسے ہیں جنسے (بڑی بڑی) نہریں پھوٹ کر چلتی ہیں اور ان ہی پتھروں میں بعضے ایسے ہیں کہ جو شق ہو جاتے ہیں پھر ان سے (اگر زیادہ نہیں تو تھوڑا ہی) پانی نکل آتا ہے اور ان ہی پتھروں

لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝

بعضے ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی خوف سے اوپر سے نیچے لڑھک آتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بیخبر نہیں ہیں

بدبختی نے تمہارا پیچھا نہ چھوڑا

"ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ" مراد بنی اسرائیل کے منکر و کافر ہیں مقتول کے جن بھتیجوں کا ذکر پچھلی آیتوں میں ہوا ہے، کہا گیا ہے کہ انھیں کی طرف اشارہ ہے، انھیں سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "پھر اس کے بعد بھی تمہارے دل سخت ہی رہے"۔ "قَسَتْ" (جس کا ایک صیغہ "قَسَتْ" ہے) اور "جَفَتْ" اور "عَتَتْ" ہم معنی الفاظ ہیں سختی صلابت اور قساوت کے موقعہ پر ان کا استعمال ہوتا ہے۔ "مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ" یعنی اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے اس مقتول کو زندہ کر دیا تھا جس کے قتل کے بارے میں وہ جھگڑ رہے تھے اور اس مقتول نے اپنے قاتل کی اطلاع بھی لوگوں کو دیدی۔ یہ بھی انہیں معلوم ہو گیا کہ قتل کا اصل سبب کیا تھا اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے سچ اور جھوٹ کو الگ الگ کر دیا، لیکن ان کا دل پھر بھی سخت ہی رہا۔ جیسا کہ ہمیں روایتوں سے معلوم ہوا ہے، ان کے دل کی سختی یہ تھی کہ مقتول کے دوبارہ زندہ ہو جانے اور اس اطلاع دینے کے بعد کہ مجھے فلاں نے قتل کیا ہے قاتل پھر بھی اپنے سابقہ انکار پر جمے رہے اور یہی کہتے رہے کہ ہم نے اسے نہیں قتل کیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب مقتول پر گائے کا کوئی ٹکڑا مارا گیا تو وہ زندہ ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ تمہیں کس نے قتل کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میرے بھتیجوں نے مجھے قتل کیا ہے۔ پھر اس کی روح قبض کر لی گئی۔ جب دوبارہ وہ مردہ بنا دیا گیا تو اس کے بھتیجے کہنے لگے کہ خدا کی قسم ہم نے اسے قتل نہیں کیا تھا۔ یعنی حق کے مشاہدہ کے بعد بھی وہ جھوٹ بولنے سے باز نہ آئے اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "پھر اس کے بعد بھی تمہارے دل سخت ہی رہے"۔ یعنی اس بوڑھے مقتول کے بھتیجوں کے "پس وہ مثل پتھر کے ہیں۔ بلکہ سختی میں اس سے بھی بڑھ کر"۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے کہ اس کے بعد بھی جبکہ اللہ تعالیٰ نے مقتول کو زندہ کر کے انھیں دکھا دیا اور اس کا معاملہ بالکل واضح اور صاف ہو گیا۔ پھر بھی تمہارا دل سخت ہی رہا۔

Marfat.com

"فَھِیَ کَالْحِجَارَۃِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَۃً" یعنی تمہارے دل (مثل پتھر کے ہیں، بلکہ سختی میں اسی سے بھی بڑھکر) مطلب یہ ہے کہ حق دیکھنے کے بعد بھی تمہارے دل سخت ہی رہے، سب کچھ تمہارے سامنے ظاہر ہو گیا تھا اور تم نے جوب سمجھ لیا تھا کہ اللہ تعالےٰ کا کیا حق تم پر واجب ہے۔ پس قساوت اور سختی میں تمہارے دل پتھر کی طرح ہیں یا اس سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ یعنی اللہ تعالےٰ کا جو حق تم پر واجب ہے اسے ماننے اور اس کا اقرار کرنے میں تمہارے دل پتھر کی طرح ہیں۔

کلمہ "اَوْ" کی تحقیق

"کَالْحِجَارَۃِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَۃً" کا لفظ "اَوْ" کلام عرب میں عام طور سے شک کے اظہار کے لئے (معنیٰ) استعمال ہوتا ہے اور شک کا اظہار اللہ تعالیٰ کی طرف سے جائز نہیں ہے۔ اس کا ایک جواب یہ دیا جاتا ہے کہ یہ اظہار اللہ تعالےٰ اپنی طرف سے نہیں کر رہا ہے، بلکہ ان لوگوں کے خیال اور نقطۂ نظر کی اطلاع دے رہا ہے، جن کے ساتھ قاتلوں کا قتل کے معاملہ میں جھگڑا تھا اور جو صحیح صورت حال کو سمجھ گئے تھے اور اس پر یقین لائے تھے کہ . . . . اللہ تعالےٰ کی اتنی بڑی نشانی دیکھنے کے بعد بھی ان کے انکار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل پتھر جیسے ہیں یا سختی میں اس سے بھی زیادہ ہیں۔ اس لفظ "اَوْ" کے معنی کے متعین کرنے کے سلسلے میں عربی زبان و ادب کے ماہر علماء کے کئی اقوال ہیں۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ متکلم یعنی بولنے والے کو بعض اوقات جبکہ اسے اپنے طور پر تو یقین ہوتا ہے لیکن وہ مخاطب اور سننے والے کے سامنے اس معاملہ کو مبہم رکھنا چاہتا ہے تو کلام عرب میں ایسے مواقع کے لئے بھی "اَوْ" کا استعمال کرتے ہیں۔ اس آیت کے علاوہ خود قرآن مجید میں متعدد دوسری آیتوں میں اسی طرح "اَوْ" کا استعمال ہوا ہے۔ مثلاً اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے: "وَاَرْسَلْنٰہُ اِلٰی مِائَۃِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ" (اور ہم نے ان کو ایک لاکھ آبادی یا اس سے بھی زیادہ کی طرف (پیغمبر بنا کر) بھیجا) ایک دوسرے موقعہ پر ارشاد ہے "وَاِنَّا اَوْ اِیَّاکُمْ لَعَلٰی ھُدًی اَوْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ" (اور ہم یا تم ہی ضرور راہ راست پر ہیں یا صریح گمراہی میں) . . . . . حالانکہ متکلم خوب جانتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون ہے۔ عام محاورہ میں بھی استعمال ہوتا ہے "اَکَلْتُ بُسْرَۃً اَوْ رُطَبَۃً" (میں نے کچی کھجور کھائی یا پکی ہوئی تازہ) متکلم خوب جانتا ہے کہ اس نے کس طرح کی کھجور کھائی تھی لیکن وہ صرف مخاطب اور سننے والے کے سامنے صورت حال کو مبہم رکھنا چاہتا ہے کلمہ "اَوْ" کا استعمال ایسے مواقع پر بھی ہوتا ہے جب کہ مذکورہ دونوں چیزیں مراد ہوں اور بعض علماء کا خیال ہے کہ آیت میں بھی یہی معنی مراد لیا گیا ہے۔ بولتے ہیں "مَا اَطْعَمْتُکَ اِلَّا حُلْوًا اَوْ حَامِضًا" (میں نے تمہیں میٹھی یا کھٹی چیزیں ہی کھلائی ہیں) تو یہاں "اَوْ" سے پہلے اور اس کے بعد جن دو قسموں کا ذکر ہے وہ دونوں ہی مراد ہیں۔ کلام میں "اَوْ" کا مطلب یہ نہیں لیا جا سکتا کہ متکلم کو اس سلسلے میں کوئی شک و شبہ تھا کہ اس نے مخاطب کو میٹھی چیز کھلائی یا کھٹی، بلکہ وہ پورے یقین کے ساتھ اطلاع دے رہا ہے کہ میں نے تمہیں جو چیزیں کھلائیں وہ میٹھی تھیں یا کھٹی، ان دو قسموں کے سوا کوئی تیسری قسم کی چیز میں نے تمہیں نہیں کھلائی۔ ان علماء کا خیال ہے کہ اسی طرح آیت "فَھِیَ کَالْحِجَارَۃِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَۃً" میں بھی مراد لیا گیا ہے، یعنی ان کے دل بس ان دو ہی اقسام میں منحصر تھے، یا وہ پتھر کی طرح سخت تھے یا اس سے بھی بڑھ کر سخت تھے۔ اس تفسیر کی بنیاد پر مطلب یہ ہو گا کہ ان انکار کرنے والوں میں بعض کے دل تو ایسے تھے جیسے پتھر اور بعضوں کے دل پتھر سے بھی زیادہ سخت تھے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ "اَوْ" بمعنی "وَ" (اور) ہے۔ اسی معنی میں قرآن مجید میں اور ایک موقعہ پر آیا ہے "وَلَا تُطِعْ مِنْھُمْ اٰثِمًا اَوْ کَفُوْرًا" (اور ان میں سے کسی فاسق یا کافر کے کہنے میں نہ آیئے اٰثِمًا وَّ کَفُوْرًا" جریر بن عطیہ کے ایک شعر میں بھی "اَوْ" اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

نَالَ الْخِلَافَۃَ اَوْ کَانَتْ لَہٗ قَدَرًا ۔۔۔ کَمَا اَتٰی رَبَّہٗ مُوْسٰی عَلٰی قَدَرٍ

انھیں خلافت مل گئی اور وہ ان کے لئے مقدر تھی۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کے پاس وقت متعینہ پر حاضر ہوئے تھے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ "اَوْ" آیت میں "بَلْ" (بلکہ) کے معنی میں آیا ہے۔ ان کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ "بس وہ مثل پتھر کے ہیں بلکہ سختی میں اس سے بھی بڑھ کر ہیں"۔ جیسے آیت "وَاَرْسَلْنٰہُ اِلٰی مِائَۃِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ" (اور ہم نے ان کو ایک لاکھ کی آبادی یا اس سے بھی زیادہ کی طرف بھیجا) میں "اَوْ" بمعنی بَلْ (بلکہ) ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ "تمہارے خیال کے مطابق

Marfat.com

ان کے دل پتھر کی طرح ہیں، یا سختی میں اس سے بھی بڑھ کر"۔ اَوْ کے سلسلے میں جتنے بھی اقوال اس موقعہ پر نقل کئے گئے ہیں، ان سب کا ثبوت عربی زبان وادب میں ملتا ہے، لیکن میرے نزدیک پسندیدہ قول وہی ہے جو میں نے ابتداء میں بیان کیا تھا اور آیت کی یہ تفسیر زیادہ بہتر رہے گی کہ کہا جائے کہ ان میں سے بعض کے دل پتھر جیسے ہیں اور بعض کے سختی میں اس سے بھی بڑھ کر ہیں۔ اس لئے کہ اگرچہ "اَوْ" کا استعمال کلام عرب میں "وَ" (اور) کے معنے میں بھی آتا ہے، لیکن اس کا حقیقی مفہوم یہی ہے کہ جن دو چیزوں کے درمیان میں آئے ان میں سے کوئی ایک مراد لیا جائے۔ ایک ساتھ دونوں کو نہ ملا دیا جائے۔ اس لئے اگر آیت میں لفظ کے حقیقی معنی مراد لیکر تفسیر ممکن ہو تو پھر حقیقت کو چھوڑ کر مجازی معنی کیوں مراد لیا جائے؟

پتھر بھی پسیج جاتا ہے

"وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ" یعنی پتھروں میں ایسا بھی پتھر ہے جس سے پانی پھوٹ کر نکلتا ہے اور اس سے دریا بن جاتے ہیں۔ آیت کے الفاظ میں پانی کا ذکر نہیں ہے، لیکن "دریا" کے ذکر کر دینے سے خود پانی کا وجود ذہناً متحقق ہو جاتا ہے۔ "تَفَجَّرَ" "فَجَرَ الْمَاءُ" سے نکلا ہے، اسوقت بولتے ہیں جب پانی سوتے سے نکل کر نیچے گرتا ہے۔ ہر ایسی بہنے والی چیز کے لئے جو اپنی اصلی جگہ سے خارج ہوتی ہو اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں" وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ" یعنی پتھروں میں ایسا بھی پتھر ہے کہ پھٹ جاتا ہے اور اس میں سے پانی نکلتا ہے اور چشمہ اور دریا بن جاتا ہے" وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ" یعنی پتھر کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ کے خوف وخشیت سے پہاڑ کی چوٹی سے نیچے زمین پر گر جاتا ہے" ان آیات میں کلمہ "لَمَا" میں لام خبر کی تاکید کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالےٰ پتھر کے اوصاف بیان کرتا ہے کہ بعض پتھروں سے دریا پھوٹ نکلے ہیں، بعض پھٹ گئے اور ان سے پانی کی سوتیں جاری ہو گئیں، اور بعض ایسے ہیں کہ اللہ کی ہیبت وخوف سے نیچے آگرے ہیں، مقصد مقابلہ ہے ان پتھروں کا بنی اسرائیل کے ان افراد سے جو عقل رکھتے ہیں، فہم اور سمجھ اللہ تعالےٰ نے انھیں دی ہے اور اس کے بعد اپنی عظیم نشانیوں کا انھیں مشاہدہ کرایا عجیب وغریب دلائل ان کے سامنے پیش کئے۔ لیکن اس کے باوجود اس سخت دلی اور فساد ت کا مظاہرہ کیا جو پتھروں میں بھی نہیں پائی جاتی، کہ بہت سے پتھر تو ایسے بھی ہیں جنسے دریا پھوٹ کر نکلتے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی بہنے لگتا ہے اور بہت سے ایسے ہیں جو اللہ کے خوف سے نیچے گر جاتے ہیں۔ پس اللہ تعالےٰ نے بتایا ہے کہ بہت سے پتھر بھی ایسے ہیں جو ان کے دل کے مقابلہ میں نرم ہیں۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے یہی تفسیر روایت ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہر وہ پتھر جس سے دریا پھوٹ کر نکلتا ہے، جو پھٹ جاتا ہے اور اس سے پانی بہنے لگتا ہے اور جو پہاڑ کی چوٹی سے لڑھک کر گرتا ہے تو اللہ کی خشیت اور اس کی ہیبت سے ایسا ہوتا ہے، کہ اللہ تعالےٰ نے خود قرآن مجید میں اس کے متعلق ان آیات میں فرمایا ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ پتھر سخت ہوتا ہے لیکن اللہ تعالےٰ نے ان آیات میں اس کی طرف سے معذرت کی ہے، لیکن شقی اور بدبخت انسانوں کی طرف سے کوئی معذرت نہیں کی یعنی پتھر میں تو ایسے بھی ہیں جنسے دریا پھوٹ کر نکلتا ہے اور جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کے الفاظ سے ملتے جلتے ہیں۔

علماء نحو کے "ھبوط" (گرنے) کے معنی کے سلسلے میں کئی اقوال ہیں۔ یعنی آیت کے یہ الفاظ کہ بعض پتھر ایسے ہیں جو اللہ کے خوف وخشیت سے گر پڑتے ہیں۔ اس سے کیا مراد ہے؟ بعض علماء نے کہا ہے کہ اس سے اشارہ پہاڑ کے سایہ کے جھکنے کی طرف

---

۵۸ "اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً" میں کلمہ "اَشَدُّ" پر رفع کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ معنی کاف پر عطف مانا جائے کیونکہ کاف کے معنی "مثل" ہیں اور یہ مرفوع ہے، اس لئے اس پر عطف مان کر "اشد" بھی مرفوع ہو گیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ "ھِیَ" کو مقدر مانا جائے؛ یعنی "فھی کالحجارۃ او ھی اشد قسوۃ" (ابن جریر)

Marfat.com

ہے کہ اللہ کی ہیبت سے ایسا ہوتا ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ مراد اس سے وہ پہاڑ (طور) ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے تجلی کی تھی اور اللہ رب العزت کی تجلی سے پہاڑ چور چور ہو گیا تھا۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بہت سے پتھروں کو معرفت اور سمجھ بھی عطا فرمائی ہے، وہ اللہ کی طاعت کی پہچان رکھتے ہیں اور اس کی طاعت کرتے ہیں جیسے کھجور کے اس تنے کے متعلق احادیث میں آتا جس پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے کہ جب اسے (ممبر بن جانے کے بعد) ہٹا دیا گیا تو اس سے رونے کی آواز آنے لگی اور جیسا کہ ایک روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ایک پتھر زمانہ جاہلیت میں مجھے سلام کیا کرتا تھا اور میں اسے اب بھی پہچانتا ہوں۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ آیت میں "اللہ کے خوف سے نیچے آگرتا ہے" ایسا ہی ہے جیسے (خضر و موسیٰ علیہما السلام کے واقعہ کے سلسلے میں) اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ "جِدَارًا يُرِيدُ أَنْ يَنْقَضَّ" (دیوار جو بھی گرنا ہی چاہتی تھی) حالانکہ دیوار کوئی ذی روح چیز نہیں کہ اس کی طرف ارادہ کی نسبت کی جائے۔ انہوں نے کہا کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ "اللہ کی عظمت و ہیبت کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے گویا پہاڑ گرنے ہی والا ہے"۔ بعض علماء نے کہا کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ "دوسروں میں اللہ کی خشیت پیدا کرنے کا سبب ہے کہ اپنے بنانے والے پر وہ ایک کھلی نشانی ہے۔ اسی طرح "نَاقَةٌ تَاجِرَةٌ" (تجارت کرنے والی اونٹنی) ایسی اونٹنی کے لئے بولتے ہیں جو اتنی عمدہ، فربہ اور اصلی نسل کی ہو کہ لوگ خود بخود اس کی طرف متوجہ ہو جایا کریں۔ جریر بن عطیہ کا ایک شعر ہے

وَاَخْوَرَ مِنْ نَبْهَانَ اَمَّا نَهَارُهٗ — فَاَعْمٰى وَاَمَّا لَيْلُهٗ فَبَصِيْرُ

قبیلہ نبہان کا ایک کانا جس کا دن — تاریک ہے اور جس کی رات روشن ہے

شاعر نے اپنے معاصر نبہانی کی ہجو کی ہے، لیکن تاریکی اور روشنی کی صفت کا رات اور دن کے ساتھ تعلق قائم کرتا ہے، حالانکہ مراد وہی نبہانی ہے، حقیقت میں رات اور دن مراد نہیں ہیں۔ آیت کی تفسیر کی جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں، یہ اقوال بھی ان سے کچھ بعید نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ سلف کے مفسرین سے جو اقوال آیت کی تفسیر میں منقول ہیں، ان سے یہ مختلف ہیں اس لئے ہم ان اقوال کی روشنی میں کوئی تفسیر نہیں کر سکتے۔ اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ "خَشْيَةٌ" کا معنی ڈر اور خوف ہے۔ "وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ" یعنی اے اللہ کی نشانیوں کو جھٹلانے والو! اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنے والو! اور اے نبی کے متعلق جلے سڑے باتیں گھڑنے والے بنی اسرائیل اور ان کے علماء! جو بہودے اور گندے اعمال تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ اللہ صرف تمہیں ڈھیل دے رہا ہے اور آخرت میں تمہیں اس کا بدلہ دے گا یا پھر دنیا میں ہی اپنے جرائم کا خمیازہ تم بھگت لو گے۔ "غَفْلَةٌ" (جس سے "غَافِلٌ" نکلا ہے) کا اصل مفہوم یہ ہے کہ کوئی چیز بھول کر چھوڑ دی جائے یا کوئی کام انجام نہ دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ انہیں خبردار کرتا ہے کہ انکے برے اعمال سے وہ غافل نہیں ہے بلکہ سب کچھ اس کے احاطہ علم میں ہے۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ

اے مسلمانو! کیا اب بھی تم توقع رکھتے ہو کہ یہ (یہودی) تمہارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے حالانکہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے گزرے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے تھے اور پھر اس کا کچھ کا کچھ

ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

کر ڈالتے تھے (اور) اس کو سمجھنے کے بعد (ایسا کرتے) اور (لطف یہ کہ) جانتے (بھی) تھے۔

ان سے آپ کو ایمان کی توقع ہے!

"اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ" یعنی اے اصحاب محمد! اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والو! کیا تمہیں توقع ہے کہ بنی اسرائیل تمہاری وجہ سے ایمان لائیں گے اور ان باتوں کی تصدیق کریں گے جو تمہارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے رب کے پاس سے لیکر مبعوث ہوئے ہیں۔

Marfat.com

ربیع اور قتادہ رحمہما اللہ سے بھی یہی روایت ہے کہ آیت سے مراد یہودی ہیں کہ کیا تم اُن سے ایمان لانے کی توقع رکھتے ہو۔ "وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ" (حالانکہ انہیں کی ایک جماعت) "فَرِيقٌ" تفرق سے فَعِيلٌ کے وزن پر جمع کا صیغہ ہے لیکن لفظ "طَائِفَةٌ" کیطرح انہیں حروف کے ساتھ اس کا کوئی واحد نہیں ہے، گروہ اور جماعت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ "مِّنْهُمْ" یعنی بنی اسرائیل میں سے اشارہ بنی اسرائیل کی اس جماعت کی طرف ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھی، اور ان کا "کارنامہ" ذکر کرکے ان یہودیوں کے متعلق کہا جا رہا ہے جو آنحضور کے زمانہ میں مدینہ میں موجود تھے کہ جن کے اسلاف اور باپ دادوں نے یہ کارنامے انجام دیئے ہوں اور جو خود بھی ان کی اتباع کو فخر سمجھتے ہوں، کیا تم اُن سے توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہارے کہنے سننے سے ایمان لے آئیں گے "يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِن بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ" (ایسی تھی جو اللہ کا کلام سنتی تھی پھر اس میں تحریف اور تبدیلی کر دیتی تھی بعد اس کے وہ سمجھ چکے تھے اور خوب جانتے بھی تھے) مفسرین کے اس سلسلے میں کئی اقوال ہیں کہ جس جماعت کا آیت میں ذکر ہوا ہے اس سے مراد کون لوگ ہیں؟ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ "جو لوگ اللہ کے کلام میں تحریف اور تبدیلی کرتے تھے اور اسے چھپاتے تھے وہ بنی اسرائیل کے علماء تھے (اور ایسے علماء نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی مدینہ میں موجود تھے) سدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مراد توریت ہے جسمیں وہ تحریف اور تبدیلی کرتے رہتے تھے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے کہ مراد توریت ہے جس کو وہ کچھ سے کچھ کرتے رہتے تھے، اس کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بناتے تھے۔ اگر کوئی شخص ان میں سے حق پر ہوتا اور انھیں رشوت دیتا تو اس کا اللہ کی کتاب سے فیصلہ کرتے تھے اور اگر حق پر نہ ہوتا اور انھیں رشوت کھلاتا تو اس کے لئے بھی اللہ کی کتاب نکال لاتے تھے اور اس کے حق میں فیصلہ کر دیتے تھے۔ لیکن اگر کوئی شخص انھیں رشوت نہ کھلاتا تو اور حق پر بھی نہ ہوتا تو اس کا فیصلہ صحیح کرتے تھے۔ اس مضمون کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان کیا ہے کہ "پس کیا تم حکم دیتے ہو لوگوں کو نیکی کا اور بھلا دیتے ہو اپنے آپ کو، حالانکہ تم کتاب بھی پڑھتے ہو، تو کیا تم اتنی بات بھی نہیں سوچتے" لیکن ان اقوال سے مختلف ایک دوسرا قول مفسرین کا، جیسا کہ ربیع رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، یہ ہے کہ (مراد موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے بنی اسرائیل ہیں) اور جس طرح اللہ کا کلام نبی نے سنا تھا اسی طرح انھوں نے بھی سنا تھا، لیکن اس کے باوجود اسے کچھ سے کچھ کر دیا، بعد اس کے کہ اسے سمجھ چکے تھے اور خوب اسے جانتے بھی تھے۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی کے مطابق فرمایا کہ بنی اسرائیل کے وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے اللہ کو دکھانے کا مطالبہ کیا تھا اور پھر انہیں ایک کڑک نے آپکڑا تھا۔ محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے تفصیلی روایت میں منقول ہے کہ بعض اہل علم سے مجھے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ اے موسیٰ! ہم اللہ کا دیدار تو نہیں کر سکے، لیکن جب آپ سے اللہ گفتگو کرے تو اسوقت ہمیں بھی اس کی گفتگو سنا دیجئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں اس کے لئے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، انھیں حکم دیجئے کہ وہ پاک ہو جائیں اور اپنے کپڑے پاک کریں، اور روزے رکھیں۔ انہوں نے اس کے مطابق عمل کر لیا تو موسیٰ علیہ السلام انھیں لیکر نکلے اور طور پہاڑی پر پہنچے۔ پھر جب بادل نے انھیں چھپا لیا تو آپ نے انہیں حکم دیا اور وہ سجدہ میں گر پڑے اور اسوقت موسیٰ علیہ السلام سے آپکے رب نے کلام کیا۔ بنی اسرائیل نے بھی اللہ کا کلام سنا کہ اللہ تعالیٰ کچھ چیزوں کے کرنے کا حکم دے رہا ہے اور بعض چیزوں سے منع کر رہا تھا۔ بنی اسرائیل کے ان افراد نے جو کچھ سنا تھا اسے سمجھ بھی لیا اور پھر موسیٰ علیہ السلام انھیں ساتھ لیکر بنی اسرائیل کے پاس واپس ہوئے۔ لیکن یہاں آنے کے بعد ان میں سے ایک جماعت نے اللہ کے حکم میں تحریف اور تبدیلی کر دی اور جب موسیٰ علیہ السلام نے قوم بنی اسرائیل سے کہا کہ اللہ تمہیں فلاں فلاں باتوں کا حکم دیتا ہے تو اس جماعت نے اللہ کے احکام کے خلاف ایسے کہنا شروع کیا کہ نہیں، بلکہ تمہیں اللہ نے فلاں فلاں باتوں کا حکم دیا ہے اسی جماعت کا آیت میں ذکر ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے انھیں کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے ان دونوں تفسیروں میں بہتر و مناسب اور آیت کی ظاہری ترتیب اور سیاق و سباق کے مطابق ربیع بن انس اور ابن اسحاق رحمہما اللہ کی وہ تفسیر ہے جو انہوں نے بعض اہل علم سے نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں بنی اسرائیل کے وہ لوگ مراد لئے ہیں جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی طرح

Marfat.com

اللہ تعالٰے کا کلام خود اللہ رب العزت سے سنا تھا اور پھر سننے اور اسے سمجھ لینے کے بعد اس میں تحریف اور تبدیلی کردی تھی، کیونکہ اللہ تعالٰے نے اس آیت میں بتایا ہے کہ اللہ کے احکام میں تبدیلی ان میں سے ایک جماعت نے کی تھی جو اللہ کا کلام سنتے تھے۔ اللہ تعالٰے نے صیت کیسا تھ اس واقعہ کو بیان فرماتا ہے کہ ہر طرح کی حجت تمام کر دینے کے بعد بھی وہ بہتان تراشی اور اللہ کے کلام میں تبدیلی سے باز نہیں آئے اور پھر مومنین کو مخاطب کرتا ہے کہ ان لوگوں سے جو ایسے افراد کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں تم توقع رکھتے ہو کہ وہ اس حق، نور اور ہدایت پر ایمان لائیں گے جسے لیکر محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس نور اور ہدایت کی طرف دعوت دیتے ہیں وہ ان کیلئے غیب ہے، خود انہوں نے اس کا مشاہدہ نہیں کیا ہے، ان کے اسلاف میں تو بعض ایسے لوگ بھی گذرے ہیں جنھوں نے اللہ کے کلام کو۔۔ اس کے حکم اور نہی کو خود اللہ سے۔۔ اور پھر اس میں تبدیلی اور تحریف کر دی۔ پس انھیں کی نسل کے یہ لوگ جو آپ کے زمانہ میں ہیں۔ اگر آپ کا انکار کرتے ہیں اور اپنی کتاب کی ان آیات میں تحریف و تبدیلی کرتے ہیں جنہیں آپ کا ذکر ہے تو کوئی حیرت کی بات نہیں کہ انہوں نے کم از کم آپ کو اس طرح۔۔ تو نہیں دیکھا ہے جس طرح ان کے اسلاف نے موسٰی علیہ السلام کو اللہ سے ہم کلام ہوتے دیکھا تھا اور نہ انہوں نے اللہ کو آپ سے کلام فرماتے سنا ہے۔ انھیں تو ان کا رد کفر کرنا ہی چاہئے! اس لئے اگر آیت "یسمعون کلام اللہ" سے مراد یہ لیا جائے کہ "جو اللہ کی کتاب توریت سنتے ہیں" تو پھر اس موقعہ پر اس جملہ کا کوئی خاص مفہوم باقی نہیں رہتا، کیونکہ جنھوں نے توریت میں تحریف کی تھی وہ بھی اسے سنتے تھے اور تمام دوسرے بنی اسرائیل بھی سنتے تھے جن کا براہ راست تحریف و تبدیلی سے کوئی تعلق نہیں تھا، اس لئے اللہ کی کتاب میں تبدیلی کرنے والوں کے ذکر کے ساتھ صرف ان کی اس خصوصیت پر زور دینا کہ "وہ توریت کو سنتے تھے" خاص مفہوم نہیں پیدا کرسکتا جو اللہ تعالٰی اس آیت میں مراد لینا چاہتا ہے، توریت تو سارے ہی یہودی سنتے تھے۔ اگر یہی مراد ہوتا تو یوں آیت ہوتی کہ "کیا تم توقع رکھتے ہو کہ وہ لوگ تمہاری وجہ سے ایمان لائیں گے، حالانکہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ کے کلام میں تحریف و تبدیلی کرتے ہیں، بعد اس کے کہ اسے سمجھ چکے ہیں اور وہ اسے خوب جانتے بھی ہیں" (خاص طور سے اللہ کے کلام کو سننے کا ذکر نہ ہونا چاہئے تھا) لیکن آیت اس ترتیب کے ساتھ نہیں بیان کی گئی، بلکہ یہودیوں کے ایک خاص طبقہ (فَرِيقٌ مِّنْهُمْ) کا ذکر خصوصیت سے ہوا کہ انھیں اللہ کا کلام سننے کا بھی موقعہ دیا گیا (يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ) یہ ایسی خصوصیت تھی جو انبیاء کے سوا کسی اور کو حاصل نہ تھی لیکن اس کے باوجود تحریف اور تبدیلی سے باز نہ آئے، اللہ تعالٰے نے ایک خاص جماعت کا ذکر یہاں ان کی اسی خصوصیت کی وجہ سے کیا۔ "يُحَرِّفُونَهُ" یعنی اسے بدل دیتے ہیں، کچھ کا کچھ کر دیتے ہیں، اصل میں "اِنْحِرَاف" سے نکلا ہے، اسوقت اس کا استعمال کرتے ہیں جب ایک چیز اپنی اصل جہت اور سمت سے ہٹ کر دوسری طرف جھک جائے۔ اللہ تعالٰے آیت میں بتاتا ہے کہ انہوں نے اللہ کے کلام میں یہ تحریف و تبدیلی اس کے باوجود کی تھی کہ اللہ کے کلام کو سننے کے بعد اس کے مفہوم و مطلب کو خوب سمجھ بھی گئے تھے اور یہ جانتے ہوئے تبدیلی کی تھی کہ ان کا یہ عمل حقیقت اور اصلیت کے خلاف ہے اور وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ یہ اللہ تعالٰے کی طرف سے اطلاع ہے کہ اللہ اور اس کے رسول موسٰی علیہ السلام کی طرف سے ان کے دل کتنے پھرے ہوئے ہیں، پس یہ جو ان کی نسل کے بقایا ہیں۔ یہ بھی اپنے اسلاف کی طرح اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی اور حسد رکھتے ہیں۔

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا ۚ وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا

اور جب ملتے ہیں (منافقین یہود) مسلمانوں سے تو (ان سے تو) کہتے ہیں کہ ہم (بھی) ایمان لے آئے ہیں اور جب تنہائی میں جاتے ہیں یہ بعض (منافق) دوسرے بعض (علانیہ) یہودیوں کے پاس تو وہ ان سے

أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُم بِهِ عِندَ رَبِّكُمْ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ○

کہتے ہیں کہ تم کیا (غضب کرتے ہو کہ) مسلمانوں کو وہ باتیں بتلاتے ہو جو اللہ تعالٰے نے (توریت میں) تم پر منکشف کر دی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ تمکو حجت میں مغلوب کر دینگے کہ یہ مضمون

Marfat.com

اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ○

کیا ان کو اسکا علم نہیں ہے کہ حق تعالیٰ کو سب خبر ہے اُن چیزوں کی بھی جنکو وہ مخفی رکھتے ہیں اور اُنکی بھی جن کا وہ اظہار کر دیتے ہیں۔

منافقین یہود

"وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا" (اور جب وہ اُن سے ملتے ہیں جو ایمان لا چکے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لے آئے ہیں) یہاں بھی انھیں یہودیوں کا ذکر ہو رہا ہے جن کے اسلاف نے اللہ کا کلام خود سننے کے بعد اس میں تبدیلی کر دی تھی اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جا رہا ہے کہ آپ ان سے ایمان کی توقع نہ رکھیں، اور ان میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ "جب ان لوگوں سے ملتے ہیں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اور اس شریعت کی جسے آپ لیکر مبعوث ہوئے ہیں تصدیق کی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لے آئے ہیں اور تمہاری طرح ہم بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت کی اتباع کرتے ہیں آیت میں یہودیوں کے اس گروہ کا ذکر ہو رہا ہے جس نے منافقین کا طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ منافقین یہود مراد ہیں کہ جب وہ مومنوں سے ملتے تو کہتے کہ ہم بھی تمہاری طرح ایمان لے آئے ہیں اور جب آپسمیں تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ارے کیا تم انھیں وہ بتا دیتے ہو جو خدا نے تم پر منکشف کیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے اس آیت کی تفسیر میں ایک اور قول یہ نقل ہوا ہے کہ یہودی منافقین جب مومنین سے ملتے تو کہتے کہ ہم تمہارے نبی پر ایمان لے آئے ہیں، لیکن وہ ہمارے لئے نبی نہیں ہیں وہ تو صرف تمہارے نبی ہیں۔ اور آیت میں ان کے اسی قول کی طرف اشارہ ہے سدی رحمۃ اللہ سے روایت ہے کہ آیت میں وہ یہودی مراد لئے گئے ہیں جو ایمان لے آئے تھے، لیکن پھر منافق ہو گئے۔

ذہنی انتشار

"وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ" (اور جب آپس میں تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ارے کیا تم انھیں وہ بتا دیتے ہو جو اللہ نے تم پر منکشف کیا ہے جس سے وہ تمہیں تمہارے پروردگار کے حضور میں قائل کر دیں گے") یعنی یہ یہودی جن کا ذکر چل رہا ہے جب آپس میں تنہا ہوتے ہیں اور ان کے پاس کوئی دوسرا نہیں ہوتا، تب یہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ ارے، کیا تم انھیں وہ بتا دیتے ہو جو اللہ نے تم پر منکشف کیا ہے"۔ آیت کے اس ٹکڑے "بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ" (جسکا ہم نے ترجمہ یہ کیا ہے کہ جو اللہ نے تم پر منکشف کیا ہے) کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ "کیا تم اُن سے وہی کہتے ہو جسکا تمہیں اللہ نے حکم دیا ہے" (یعنی ایمان کا) تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو محض ان کا مذاق بنا رہے تھے"، دوسرا قول ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے اس کی تفسیر میں یہ نقل ہوا ہے کہ جب وہ یہودی مسلمانوں سے ملتے تو کہتے کہ ہم بھی تمہارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن اس حیثیت سے کہ وہ صرف تمہارے نبی ہیں۔ ہمارے لئے انکی نبوت نہیں ہے۔ لیکن جب وہ آپس میں تنہا رہ جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ عربوں کو یہ نہ بتاؤ، کیونکہ پہلے تم اس نبی کے ذریعہ ان پر فتح پانے کے آرزومند تھے لیکن وہ تو عربوں میں ہی مبعوث ہو گئے ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی۔ مطلب یہ ہے کہ "کیا تم ان کے نبی ہونے کا اقرار کر لیتے ہو تمہیں تو پہلے ہی سے معلوم ہے کہ تم سے اُن کی اتباع کا عہد و پیمان لیا گیا تھا اور وہ خود بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا ذکر ہماری کتاب میں موجود ہے اور ہم ان کی بعثت کا انتظار کیا کرتے تھے۔ ان کا پوری طرح انکار کرو، ان کی متعلق یہ بھی نہ کہو کہ وہ صرف عربوں کے نبی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" کیا یہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی بھی خبر ہے جسے یہ چھپاتے ہیں اور اس کی بھی خبر ہے جسے ظاہر کرتے ہیں"۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ "اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ" یعنی کیا تم انہیں بھی وہ اوصاف بتا دیتے ہو جو تمہاری کتاب میں اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کئے ہیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ سے آیت کے اس ٹکڑے کی تفسیر میں تیسرا قول یہ نقل ہوا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنی قریظہ کے یہودیوں کا محاصرہ کئے ہوئے تھے تو ایک دن آپ نے ان کے قلعہ کے نیچے کھڑے ہو کر فرمایا، اے بندروں کے بھائیو! اے خنزیروں کے بھائیو! اے باطل کے پوجنے والو!

Marfat.com

اس پر انہوں نے آپس میں کہا کہ یہ باتیں (کہ ہمارے آباء و اجداد میں بہت سے خدا کے عذاب کے نتیجے میں بندر اور خنزیر بنا دیئے گئے تھے) محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کس نے کہی ہیں یہ باتیں تو اللہ تعالیٰ نے صرف تمہیں پر منکشف کی تھیں اور تمہیں میں سے نکل کر ان تک پہنچی ہیں، کیا تم انھیں وہ بتا دیتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر منکشف کیا ہے۔ وہ تمہیں اسی سے قائل کریں گے۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے واسطہ سے بیان کیا کہ یہ اسوقت کا واقعہ ہے جب آنحضور نے علی رضی اللہ عنہ کو ان کے پاس بھیجا تھا۔ چوتھا قول سدّی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ہے کہ اس آیت میں ان یہودیوں کے متعلق بیان کیا گیا ہے جو پہلے ایمان لے آئے تھے، لیکن پھر وہ منافق بن گئے۔ پھر وہ صحابہ رضوان اللہ علیہم سے اپنے آباء اجداد پر عذاب الٰہی کے واقعات بیان کرتے تو اس پر انھیں بعض یہودیوں نے تنبیہ کی کہ "اللہ تعالیٰ نے تم سے عذاب کے جو واقعات بیان کئے ہیں، کیا تم انہیں ان عربوں کو بتاتے ہو اگر تم ایسا کروگے تو یہ عرب تم پر اپنی فضیلت جتانے لگیں گے اور کہنے لگیں گے کہ ہم اللہ کی بارگاہ میں تم سے زیادہ محبوب اور تم سے زیادہ باعزت ہیں، پانچواں قول ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ آپ نے آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ جب یہودیوں سے کسی چیز کے متعلق پوچھا جاتا تو بہت سے یہودی بتا دیتے کہ توریت میں فلاں فلاں واقعات بیان ہوئے ہیں اس پر ان کے سردار انھیں متنبہ کرتے کہ آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم انھیں وہ باتیں بتا دیتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر نازل کی ہیں، اس سے تو وہ اللہ کے یہاں تمہارے خلاف اسی کو دلیل بنا لیں گے، تمہیں کچھ عقل بھی ہے"۔ بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا تھا کہ ہمارے پاس مدینہ میں مسلمانوں کے سوا اور کوئی نہ آئے۔ اس لئے یہود کے سرداروں نے اپنے ماننے والوں سے کہا کہ تم جا کر کہو کہ ہم ایمان لے آئے ہیں (لیکن عقیدہ تمہارا نہ بدلے) اور پھر یہاں اپنے گھر واپس آ کر انکار کر دیا کرو۔ وہ یہودی (اپنے کاروبار کے لئے) صبح کے وقت مدینہ آ جاتے تھے اور عصر بعد اپنے گھر واپس چلے جاتے تھے ایک دوسری آیت میں بھی یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے "وَقَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ" (اور اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ ایمان لانے والوں پر جو نازل ہوا ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور دن کے آخر میں اس سے انکار کر بیٹھو، عجب کیا کہ وہ بھی پھر جائیں)

چنانچہ یہ یہودی جب صبح کے وقت مدینہ میں داخل ہوتے تو کہتے کہ ہم بھی مسلمان ہیں اور مقصد یہ ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص خبریں معلوم کریں، لیکن جب اپنے گھر واپس جاتے تو کفر و انکار کرتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے اس نفاق کی اطلاع دے دی تو ان کا اس طرح آنے جانے کا سلسلہ بند ہو گیا اور وہ مدینہ میں نہیں داخل ہو سکتے تھے۔ (جس زمانہ میں ان کا مسلمانوں کے پاس عام آنا جانا تھا تو مسلمان انہیں بھی سچا مومن ہی سمجھتے تھے۔ اس لئے ان سے پوچھتے تھے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے تمہارے بارے میں فلاں فلاں باتیں نہیں کہی ہیں؟

وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے واقعی ہمارے بارے میں یہ باتیں کہی ہیں (یعنی اُن کی سرکشی اور عذاب وغیرہ کے متعلق) پھر جب وہ یہودی اپنی قوم کے پاس واپس آتے تو ان کے سرداران سے کہتے کہ "ارے کیا تم انھیں وہ بتا دیتے ہو جو اللہ نے تم پر منکشف کیا ہے آیت زیر تفسیر "بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ" میں لفظ "فتح" کا اصل مفہوم مدد کرنا، فیصلہ کرنا اور حکم دینا ہے۔ بولتے ہیں اَللّٰهُمَّ افْتَحْ بَيْنِي وَبَيْنَ فُلَانٍ" یعنی اے اللہ میرے اور فلاں کے درمیان فیصلہ کر دے، قاضی کو اسی سے "فتّاح" (فیصلہ کرنے والا) کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد "رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ" میں بھی "فتح" کا یہی مفہوم مراد لیا گیا ہے، یعنی اے ہمارے رب! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیجئے، اور آپ بہترین فیصلہ کرنے والے ہیں" بس جب "فتح" کا معنیٰ "فیصلہ کرنا ہے" تو اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زیر تفسیر آیت "أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُم بِهِ عِندَ رَبِّكُمْ" کا مطلب یہ ہوگا کہ کیا تم مسلمانوں کو وہ بتا دیتے ہو جسکا اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے اور جسکا تمہارے بارے میں فیصلہ کیا ہے"۔ اور اللہ تعالیٰ کا حکم یہودیوں کو وہ تھا جو اس نے ان سے توریت میں میثاق اور عہد لیا تھا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی

Marfat.com

شریعت پر ایمان لائینگے اور اس کا فیصلہ انکے بارے میں یہ ہوا تھا کہ ان میں سے اُس نے بندر اور سور بنا دیئے تھے اور اسکے علاوہ دوسرے احکام اور بہت سے عذاب انپر نازل کئے تھے اللہ تعالیٰ کے یہ تمام احکام اور جب وہ نافرمانی اور سرکشی کرتے تو عذاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و مسلمانوں کیلئے ان یہودیوں کے خلاف دلیل اور حجت تھے جو توریت پر تو ایمان کا دعویٰ کرتے تھے لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کرتے تھے اسلئے میرے نزدیک ان مفسرین کا قول آیت کی تفسیر میں زیادہ بہتر ہے، جنہوں نے کہا ہے کہ آیت "اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ" سے مراد محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہے.....

..... کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے شروع میں ان کی اس روش کو بتایا تھا کہ جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے سامنے آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت پر ایمان لے آئے" اس کے بعد مسلسل "بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ" تک انھیں کے متعلق بیان ہوا ہے، اس لئے آیت کے آخری حصہ کو بھی اپنے مفہوم کے اعتبار سے پہلے حصہ کے مطابق ہونا چاہئے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب ہم یہ کہیں کہ آپس میں وہ ایک دوسرے کو ملامت ان کے اسی اقرار کی وجہ سے کرتے تھے جو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے سامنے اپنے ایمان کا کیا کرتے تھے کہ" ہم بھی ایمان لائے اس شریعت پر جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے" دوسرے یہودیوں کا اعتراض یہ تھا کہ یہی تو ہماری کتاب توریت میں بھی موجود ہے اور جب تم اس طرح اقرار کر کے اپنی کتاب کے مضمون کی صحابہ کو اطلاع دیدو گے تو وہ تمہارے خلاف اسی کو اللہ کے یہاں دلیل کے طور پر پیش کریں گے۔ اصل بات یہ تھی کہ منافق یہودی اپنے ایمان کا یقین دلانے کیلئے ان اوصاف کی تفصیلات بھی صحابہ سے بیان کر دیتے تھے جو آخری نبی کے متعلق ان کی کتاب توریت میں موجود تھی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بتمام و کمال صادق آتی تھی لیکن کفر سے پھر بھی باز نہیں آتے تھے "اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ" جو یہودی صحابہ رضی اللہ عنہم کو اپنی کتاب میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان سے متعلق احکام بتا دیتے تھے انھیں دوسرے ان کے ہم مذہب ملامت کرتے ہوئے کہتے " اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ " کیا تمہیں سمجھ نہیں، عقل سے بالکل کورے ہو، ایسی باتیں بھی انھیں بتا دیتے ہو کہ وہ واقعی نبی ہیں اور ان کے لئے بھی نبی ہیں اور تمہارے لئے بھی نبی ہیں۔ کل اسی کو وہ تمہارے خلاف تمہارے رب کے پاس دلیل میں پیش کریں گے۔ ایسی باتیں ان سے نہ بتایا کرو۔ تمہارے لئے نقصان دہ ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ" (کیا یہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ کو اس کی بھی خبر ہے جسے یہ چھپاتے ہیں اور اُس کی بھی جسے یہ جتلاتے ہیں) خطاب یہودیوں سے ہے جو دوسرے یہودیوں کو اس بات پر ملامت کرتے تھے کہ مسلمانوں سے اپنی کتاب میں موجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف کی تفصیل کو وہ کیوں بتا دیتے ہیں۔ ان کے بھائی بند اپنی کتاب کی راز کی باتیں بتا دینے والے یہودیوں کو ملامت کرتے ہوئے کہتے ارے تم وہ باتیں بھی بتا دیتے ہو جو اللہ نے تم پر منکشف کی ہیں، پھر تو وہ تمہارے خلاف اسی کو تمہارے رب کے سامنے دلیل کے طور پر پیش کریں گے۔[1] اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ باتیں تم مسلمانوں سے چھپ چھپا کر اس وقت کرتے ہو جب تم آپس میں تنہا ہوتے ہو اور کوئی غیر نہیں ہوتا، مسلمانوں سے تو تم اپنی ان نجی مجلسوں کی گفتگو کو چھپا سکتے ہو، لیکن اللہ سے تمہاری کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے، وہ ان باتوں کو بھی جانتا ہے جنھیں تم چھپاتے ہو اور ان کو بھی جانتا ہے جنھیں تم ظاہر کرتے اور جتلاتے ہو، تمہارا نفاق اور تمہاری دھوکہ بازی اللہ تعالیٰ سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ چنانچہ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے آیت کی یہی تفسیر روایت ہے آپ نے فرمایا کہ جو چیز وہ چھپاتے تھے وہ ان کا کفر اور نجی مجلسوں میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار اور جھٹلانا تھا اور جو چیز وہ ظاہر کرتے تھے اس سے مراد ان کا وہ طرز عمل تھا کہ جب مسلمانوں سے ملتے تو انہیں خوش کرنے کے لئے کہنے لگتے کہ ہم بھی ایمان لے آئے۔ ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح روایت منقول ہے۔

---

[1] جیسا کہ امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے، بعض مفسرین کی یہی رائے ہے کہ "عِنْدَ رَبِّكُمْ" کا مطلب یہ ہے کہ جب تمہارے رب کے پاس حاضر ہونگے یعنی قیامت کے دن تو تمہارے انھیں انکشافات سے تمہیں قائل کریں گے۔ لیکن بعض دوسرے ائمہ مفسرین کی رائے یہ ہے کہ "عِنْدَ رَبِّكُمْ" محض تحقیقاً فوری کے مفہوم کے لئے آیا ہے، اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم اپنی کتاب توریت میں لکھی ہوئی وہ علامتیں (بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۳ پر دیکھئے)

Marfat.com

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ

اور ان (یہودیوں) میں بہت سے ناخواندہ (بھی) ہیں جو کتابی علم نہیں رکھتے لیکن (بلا سند) دل خوش کن باتیں (بہت یاد ہیں) اور وہ لوگ اور کچھ نہیں (دیسے ہی بے بنیاد) خیالات پکالیتے ہیں

يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ

تو بڑی خرابی اُن کی ہوگی جو لکھتے ہیں (بدل بدل کر) کتاب (توریت) کو اپنی ہاتھوں سے پھر (عوام) کو کہدیتے ہیں کہ یہ (حکم) خدا کیطرف سے یونہی آیا ہے (اور) غرض (صرف) یہ ہوتی ہے کہ اس ذریعہ سے کچھ

فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝

نقدرے قلیل وصول کرلیں سو بڑی خرابی (پیش) آدیگی اُن کو اسکی بدولت (بھی) جسکو اُن کے ہاتھوں نے لکھا تھا اور بڑی خرابی ہو گی اُنکو اس (نقد) کی بدولت (بھی) جسکو وہ وصول کرلیا کرتے تھے۔

لکیر کے فقیر

"مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ" (اور ان میں اَن پڑھ بھی ہیں جو کتاب الٰہی کا کوئی علم نہیں رکھتے بجز جھوٹی آرزوؤں کے) "منہم امیون" یعنی جن یہودیوں کے واقعات ان آیات میں بیان ہو رہے ہیں اور جن کے متعلق اللہ تعالٰے نے مسلمانوں سے فرمایا ہے "کیا تم اس کی توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہارے کہنے سے اسلام لائیں گے" اور جن کی عادت یہ تھی کہ جب مسلمانوں سے ملتے تو انھیں خوش کرنے کے لئے کہتے کہ ہم بھی ایمان لے آئے ہیں، تو اس آیت میں بھی انہیں کا بیان ہو رہا ہے۔ ابوالعالیہ اور ربیع اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہم سے یہی روایت ہے کہ مراد یہود ہیں کہ "ان میں بہت سے اُمّی (اَن پڑھ) ہیں "اُمّیّ" اسے کہتے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "اِنَّا اُمَّةٌ اُمِّيَّةٌ" (ہم امی (ان پڑھ) امت ہیں، حساب کتاب نہیں جانتے) میں بھی "اُمّی" سے یہی معنی مراد ہیں۔ چنانچہ ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ "مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ" کا مطلب یہ ہے کہ ان میں ایسے بھی ہیں جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح کا قول منقول ہے

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے دوسرا قول منقول ہے، آپ نے فرمایا کہ آیت میں "اُمِّيُّوْنَ" سے ایسے لوگ مراد ہیں جنھوں نے اللہ کے بھیجے ہوئے رسول کی اور اس کتاب کی تصدیق نہیں کی جسے اللہ نے نازل کیا تھا، بلکہ خود اپنی طرف سے کتاب لکھ لی اور پھر جاہل اور بیوقوف قسم کے لوگوں سے کہا کہ یہ کتاب اللہ کی نازل کی ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالٰی نے آیت میں اس کی اطلاع دی ہے کہ وہ خود (اللہ کی کتاب میں تبدیلی کرتے اور) اپنی طرف سے اس میں لکھ لیتے ہیں، اس کے باوجود انھیں "اُمی" اس لئے کہا کہ وہ اللہ کے رسول اور اس کی کتاب کا انکار کرتے تھے۔ لیکن عرب میں لفظ "اُمّی" جو جانا پہچانا، مشہور و معروف مفہوم ہے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول یہ مفہوم اس کے خلاف ہے، کیونکہ "اُمّی" تو عرب میں اسی کو کہتے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ میرا خیال ہے کہ "اُمّی" "اُمّ" (ماں) کی طرف منسوب ہے اور اسی حیثیت سے اس شخص کو کہتے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ٦٢) اور اوصاف اگر مسلمانوں کو بتادوگے جو آخری نبی سے متعلق ہیں اور جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہیں تو مسلمان اس دنیا میں لوگوں کے سامنے تمہیں قائل کریں گے اور کہیں گے کہ آنحضور کے اوصاف تو خود تمہاری کتاب میں آخری نبی کی حیثیت سے موجود ہیں۔ زیادہ راجح یہی قول معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اتنا تو یہود بھی مانتے تھے کہ اللہ تعالٰے کی بارگاہ میں حجت اور دلیل قائم کرنے اور کسی کو قائل کرنے کے لئے کسی خارجی اسباب کی ضرورت نہیں اللہ تعالٰے تو خود ہر چیز کو جانتا ہے اور اگر توریت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف ذکر ہوئے ہیں تو توریت خود اللہ تعالٰے کی نازل کی ہوئی کتاب اور اسی کا کلام ہے اور تحریف و تبدیلی کے بعد بھی وہ تمام باتوں سے خود واقف ہے۔ یہ قول کہ آیت کی مراد اسی دنیا میں حجت قائم کرنے سے ہے، روح المعانی، تفسیر کبیر، بیضاوی اور مدارک وغیرہ میں موجود ہے۔

(مترجم)

Marfat.com

ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ کیونکہ لکھنے پڑھنے کا عربی میں رواج مردوں میں تھا، عورتوں میں نہیں تھا، اس لئے مردوں میں بھی جو شخص لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا اسے "اُم" کی طرف منسوب کر کے "اُمی" کہتے تھے کہ اس حیثیت سے یہ ماں کے قریب ہے، باپ کے نہیں۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ "اُمی" کا یہی مفہوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں بھی مراد ہے کہ "ہم اُمی (اَن پڑھ) لوگ ہیں، لکھنا پڑھنا نہیں جانتے" اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد "هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ" (وہی تو ہے جس نے امی لوگوں میں انہیں میں سے ایک پیمبر بھیجا) میں بھی "امی" کا یہی مفہوم ہے۔ پس جب "اُمّی" کا مفہوم عربوں کے یہاں جانا پہچانا یہی ہے تو اس لفظ کے مفہوم کے سلسلے میں ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہی راجح ہوگا کہ "ان میں وہ بھی ہیں جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ" یعنی اللہ نے جو کچھ اپنی کتاب میں نازل کیا ہے اسے نہیں جانتے اور اللہ کی قائم کی ہوئی حدود اور اس کے احکام کو نہیں سمجھتے بلکہ اس سلسلے میں ان کی مثال جانوروں جیسی ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ "ان کی مثال جانوروں کی سی ہے جو کچھ نہیں سمجھتے اور کچھ نہیں جانتے کہ اللہ کی کتاب میں کیا ہے" ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی روایت ہے کہ "وہ لوگ نہیں سمجھتے کہ اللہ کی کتاب میں کیا ہے"۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتے اور توریت نہیں پڑھ سکتے۔

آیت میں "الْكِتَابَ" سے مراد توریت ہے۔ لفظ "کتاب" کے شروع میں الف لام اس پر دلالت کرتا ہے کہ کوئی خاص اور متعین کتاب مراد لی گئی ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ ان یہودیوں میں ایک جماعت ایسی ہے کہ نہ لکھنا پڑھنا جانتی اور نہ کتاب الٰہی کو سمجھتی ہے بس اس بات کی مدعی ہے کہ ہم اللہ کی کتاب توریت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ اس میں ہے اسے مانتے ہیں "إِلَّا أَمَانِيَّ" (بجز جھوٹی آرزوؤں) کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (جو کتاب الٰہی کا کوئی علم نہیں رکھتے) بجز جھوٹی باتوں کے جو گھڑ گھڑ کے وہ اپنے منہ سے نکالتے رہتے ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے کہ "إِلَّا أَمَانِيَّ" یعنی بجز جھوٹ کے (انھیں کتاب الٰہی کا اور کوئی علم نہیں) لیکن قتادہ اور ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہما سے روایت ہے کہ "إِلَّا أَمَانِيَّ" کا مطلب یہ ہے کہ "بجز جھوٹی آرزوؤں اور تمناؤں کے جو اللہ سے انہوں نے قائم کر رکھی ہیں، حالانکہ وہ اس کے مستحق نہیں ہیں" (کتاب الٰہی کا اور انہیں کوئی علم نہیں ہے) ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت میں اسی آخری تفسیر کی طرف رجحان پایا جاتا ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کچھ یہودی ایسے تھے جنھیں کتاب الٰہی کا کوئی علم نہیں تھا لیکن اپنے وہم کے مطابق جھوٹی روایتوں اور خرافات میں پڑے رہتے تھے اور کہتے کہ یہ کتاب الٰہی میں موجود ہے، حالانکہ اس کا اللہ کی کتاب سے کوئی تعلق نہ ہوتا یہ تو محض ان کی تمنائیں اور آرزوئیں تھیں۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ میرے نزدیک آیت کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہ اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا وہ قول زیادہ مناسب ہے جو شروع میں بیان کیا گیا ہے کہ جن اَن پڑھ یہودیوں کا واقعہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ بیان کر رہا ہے اور جن کے متعلق ارشاد ہے کہ انہیں اس کتاب الٰہی کا کوئی علم نہیں جو موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہوئی تھی (یعنی توریت) اس کے بجائے وہ محض جھوٹ بے سند روایات اور خرافات میں پڑے رہتے ہیں۔ "تَمَنِّيَ" (جس سے "أَمَانِي" نکلا ہے) کا مفہوم آیت میں "جھوٹ گھڑنا اور بولنا" ہے۔ بولتے ہیں "تَمَنَّيْتُ كَذَا" یعنی میں نے جھوٹ اور بہتان باندھا۔ عثمان رضی اللہ عنہ کے ارشاد "مَا تَغَنَّيْتُ وَلَا تَمَنَّيْتُ" میں بھی یہی مفہوم مراد لیا گیا ہے۔ یعنی نہ میں نے کوئی جھوٹ اور باطل اپنی طرف سے گھڑا ہے اور نہ کوئی بہتان تراشی کی ہے "إِلَّا أَمَانِيَّ" کی تفسیر میں ہم نے جو رائے لکھی ہے، اس کے مناسب اور درست ہونے کے لئے دوسرے دلائل کے علاوہ ایک دلیل خود آیت میں بھی موجود ہے، اسی کے بعد ارشاد ہے "وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ" (اور یہ محض تخیلات میں پڑے رہتے ہیں) یعنی یہ باطل اور جھوٹی تمنائیں اور آرزوئیں ان کے اپنے خیالات ہیں اور صرف وہم و گمان کے درجے کے، یقین اس پر نہیں ہے۔ "إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ" کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت کچھ بھی نہیں، محض ان کا وہم و گمان ہے۔ "إِنْ" "مَا" (نفی) کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد "قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" (ان سے ان کے پیغمبروں نے کہا، بیشک ہم تمہارے ہی جیسے بشر ہیں)

Marfat.com

ہیں بھی "اِنْ" "مَا" (نفی) کے معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔ "اِلَّا یَظُنُّوْنَ" کا مفہوم یہ ہے کہ صرف شکوک و شبہات میں پڑے ہوئے ہیں ورنہ حقیقت کا انھیں کوئی علم نہیں ہے۔ "ظن" آیت میں شک و شبہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ پوری آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان یہودیوں میں ایسے بھی ہیں جو لکھنا پڑھنا کچھ نہیں جانتے نہ کتاب اللہ کا انہیں کوئی علم ہے اور نہ اسے سمجھتے، صرف اپنے وہم و گمان اور اپنے تخیل کے مطابق چند خرافات اور جھوٹی باتیں اللہ تعالےٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اس پر بھی یقین نہیں رکھتے، بلکہ اس میں بھی شک و شبہ ہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اصل میں یہودیوں کا یہ جاہل اور ناخواندہ طبقہ اپنے سرداروں اور اپنے علماء و احبار سے کچھ باتیں سنتا تھا اور سمجھتا تھا کہ یہ بھی کتاب اللہ ہی میں سے ہے، حالانکہ اللہ کی کتاب سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا، اس لئے اللہ تعالےٰ ان کے متعلق فرماتا ہے کہ یہ اس چیز کی تو تصدیق کرتے نہیں جس کے متعلق یقین ہے کہ واقعی وہ اللہ کی طرف سے ہے، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت اور دین کو تو چھوڑ دیتے ہیں اور اس کے بجائے ان چیزوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں جن کے بارے میں خود انہیں شک و شبہ ہے یعنی وہ باتیں جنھیں ان کے سرداروں اور علماء نے محض اللہ اور اس کے رسول سے عناد اور دشمنی میں انھیں بنائی ہیں۔ آیت کی یہی تفسیر اسلاف سے منقول ہے۔ چنانچہ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "اِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ" یعنی محض جھوٹ بولتے ہیں۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ کی کتاب میں جو کچھ ہے اسے نہ جانتے نہ سمجھتے محض گمان اور اپنے وہم سے آپ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں۔ قتادہ، ابوالعالیہ اور ربیع رحمۃ اللہ علیہم سے روایت ہے کہ بہت سے تخیلات و اوہام میں پڑے ہوئے ہیں حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

تباہی کے راستہ پر

"فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَیْدِیْهِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِیَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا" (پس عذاب ہے ان لوگوں کے لئے جو کتاب الٰہی کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں۔ پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ اس سے قلیل معاوضہ حاصل کریں) "ویل" کے مفہوم کے سلسلے میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کا مفہوم "عذاب" نقل ہوا ہے یعنی پس ان کے لئے عذاب ہے۔ ابوعیاض رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ "ویل" وہ خون آلود پیپ ہے جو جہنم میں سب سے نیچے بہتی ہوگی، ایک روایت میں آپ سے ہے کہ جہنم میں پیپ کی وادی کا نام "ویل" ہے۔ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں نقل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ویل" جہنم کا ایک پہاڑ ہے[1]۔ ابوسعید رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ویل" جہنم کی ایک وادی ہے، اس کی گہرائی اتنی ہے کہ جب کافر کو اسکے اندر ڈالا جائے گا تو چالیس سال کے بعد اس کی تہ تک پہنچے گا۔ ان روایات کی روشنی میں آیت کی تفسیر یہ ہوگی کہ "پس جہنم کے قعر اور سب سے نچلے حصہ میں خون آلود پیپ کا عذاب ان یہودیوں کو ہوگا جو اللہ کی کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے"۔ "اَلَّذِیْنَ یَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَیْدِیْهِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِیَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا" سے بنی اسرائیل کے وہ یہودی مراد ہیں جنھوں نے اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب میں تحریف اور تبدیلی کی اور پھر اپنی طرف سے اپنے منشاء کے مطابق ایک ایسی کتاب لکھی جو اس کتاب الٰہی سے مختلف تھی جسے اللہ تعالےٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا تھا اس کے بعد اپنی طرف سے لکھی ہوئی اس کتاب کو وہ معمولی اور قلیل ... منفعت کے بدلے میں ان لوگوں کو بیچتے تھے جنھیں کتاب الٰہی کا کوئی علم نہیں تھا اور نہ وہ اس سے واقف تھے کہ توریت میں کیا لکھا ہوا ہے، اللہ کی کتاب کے مضامین سے وہ بالکل ناواقف تھے۔ اللہ تعالےٰ انھیں کے متعلق فرماتا ہے کہ خون آلود پیپ کا عذاب ہوگا۔ ان لوگوں کو اس کی بدولت جو وہ اپنے ہاتھوں سے لکھتے تھے اور اس کی بدولت جو وہ حاصل کرتے تھے سُدّی رحمۃ اللہ علیہ سے آیت کی تفسیر میں یہی روایت ہے آپ نے فرمایا کہ یہودیوں میں کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے اپنی طرف سے ایک

---

[1] غالباً اس سے بھی مراد دامن پہاڑ والی وادی ہی ہے (مترجم)

Marfat.com

کتاب لکھ لی اور پھر اسے عربوں کو بیچتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، ایسا وہ محض قلیل دنیاوی معاوضہ حاصل کرنے کے لئے کرتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آیت میں "اُمِّیُّوْنَ" سے مراد ایسے لوگ ہیں جنھوں نے اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے رسول کی تصدیق نہیں کی اور نہ اس کتاب کی تصدیق کی جسے اللہ نے نازل کیا تھا، اس کے بجائے انہوں نے خود ہی ایک کتاب لکھ ڈالی اور جاہل اور بے وقوف لوگوں سے کہنے لگے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، اس سے ان کا مقصد محض یہ تھا کہ اس کے ذریعہ معمولی پونجی حاصل کریں۔ فرمایا کہ "ثمنا قلیلاً" یعنی معمولی دنیاوی منفعت۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آیت میں وہ لوگ مراد ہیں جو جانتے اور سمجھتے تھے کہ اللہ کی کتاب میں وہ تحریف و تبدیلی کر رہے ہیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل کے کچھ افراد نے لوگوں کو بیچنے کے لئے خود ہی کتاب لکھ ڈالی اور دعویٰ کیا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں تھی۔ ابو العالیہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (توریت) میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو علامتیں بیان کی تھیں انہیں ان یہودیوں نے بدل ڈالا اور کتاب الٰہی میں اس تبدیلی سے ان کا مقصد محض دنیا کی پونجی حاصل کرنا تھا۔ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ویل" جہنم میں ایک پہاڑ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل کی ہے، کیونکہ انہوں نے توریت میں تحریف اور تبدیلی کی تھی، جو چیزیں انھیں پسند تھیں وہ اللہ کی کتاب میں لکھ دی تھیں اور اللہ کی نازل کی ہوئی جو باتیں انھیں پسند نہ آئیں انھیں کتاب الٰہی سے مٹا دیا، اسی ضمن میں انھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی توریت سے مٹا دیا، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر غضبناک ہوا اور ارشاد فرمایا کہ "عذاب ہوگا ان پر اس کی بدولت جو وہ اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور اس کی بدولت جو وہ حاصل کرتے ہیں۔[1]" "کتابت" (لکھنا) ہاتھ ہی سے ہوتا ہے اور جب بھی لکھنے کا ذکر ہوگا تو یہی سمجھا جائے گا کہ لکھنے والے نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آیت میں "کتابت" کے ساتھ "بایدیھم" (اپنے ہاتھوں سے) کا اضافہ تاکید کیلئے کیا ہے کہ خوب جانتے ہیں، سب کچھ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ محض جھوٹ، فریب اور اللہ کی کتاب کے خلاف ہے، لیکن پھر بھی تحریف و تبدیلی کرتے ہیں اور دل کھول کر کرتے ہیں۔

"فَوَیْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا کَتَبَتْ اَیْدِیْھِمْ وَوَیْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا یَکْسِبُوْنَ" (سو عذاب ہے ان کے لئے اس کی بدولت جسے ان کے ہاتھوں نے لکھا اور عذاب ہے ان کے لئے اس کی بدولت جو وہ حاصل کرتے ہیں) "فویل لھم" یعنی جہنم کے سب سے نچلے حصہ میں، جہاں پیپ کی وادی بہتی ہے انہیں عذاب ہوگا، یعنی ان بنی اسرائیل کے یہودیوں کو یہ عذاب ہوگا جن کے متعلق ہم تفصیل سے بیان کر آئے ہیں کہ اللہ کی کتاب میں تحریف و تبدیلی کر کے خود کتاب لکھتے تھے اور پھر کہتے تھے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اس سے ان کا مقصد صرف دنیا کی معمولی پونجی حاصل کرنا ہوتی تھی۔ "مِمَّا کَتَبَتْ اَیْدِیْھِمْ" یعنی اس کی بدولت جسے ان کے ہاتھوں نے لکھا۔ اسی طرح انھیں جہنم کی سب سے نیچے کی وادی میں پیپ کا عذاب ہوگا اس کی بدولت جو وہ گناہ اور برے اعمال کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے احکام کے خلاف اپنے ہاتھ سے لکھ کر حرام کمائی کرتے ہیں اور اسے کھاتے ہیں یہ لوگ جسے بھی اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی وہ کتاب بیچتے تھے اس سے یہی کہتے تھے کہ یہ اللہ کی طرف سے

[1] توریت میں تبدیلی اور تحریف کا اعتراف اب عام طور سے یہودی بھی کرتے ہیں اور کٹر سے کٹر یہودی کو بھی اس پر اصرار نہیں کہ توریت واقعی وہی ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ انیسویں صدی سے اب تک خود یہودی اور عیسائی علماء نے ہزاروں کتابیں اس موضوع پر لکھی ہیں اور کھلے دل سے اعتراف کیا ہے کہ موجودہ توریت موسیٰ علیہ السلام کی توریت سے قطعی طور پر مختلف ہے اور جو توریت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی اس کا آج دنیا میں کوئی وجود نہیں۔ یہودی جو توریت کو مانتے ہیں اور اس کے احکام پر عمل کے دعویدار ہیں وہ بھی اس کے معترف ہیں کہ موجودہ توریت انکے فرقہ کے خدا رسیدہ بزرگوں کی تصنیف ہے اللہ کا وہ کلام نہیں جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاتا ہے کہ خاصان خدا نے الہام خداوندی سے مشرف ہو کر اسے اپنے طور پر اور اپنی عبارت میں ترتیب و تالیف دیا۔ اللہ تعالیٰ کے کلام کا یہ بھی اعجاز ہے کہ تیرہ سو سال پہلے جو دعویٰ اس نے کیا تھا آج سب ہی اس کا اعتراف کر لیا۔

Marfat.com

ہے۔ ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ "مما یکسبون" سے گناہ مراد ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "فویل لہم" "ان پر عذاب ہوگا" یعنی اس کی بدولت کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے یہ جھوٹ لکھا تھا" "وویل لہم مما یکسبون" یعنی ان پر عذاب ہوگا اس کی بدولت جو وہ ناواقفوں اور جاہلوں کو جھوٹ بیچ کر کھاتے ہیں۔ "کسب" (جس سے یکسبون نکلا ہے) کا اصل مفہوم عمل ہے۔ کوئی کام اگر کوئی شخص پیشے کے طور پر اختیار کرتا ہے یا کوئی صنعت سیکھتا ہے تو اس کے لئے "کاسب" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ

اور یہودیوں نے (یہ بھی) کہا کہ ہرگز ہم کو آتش (دوزخ) چھوئے گی (بھی) نہیں مگر (بہت تھوڑے) روز (جو انگلیوں پر شمار کرلئے جاسکیں) آپ (ان سے) یوں فرمادیجئے کیا تم لوگوں نے حق تعالیٰ سے (اس کے متعلق) کوئی معاہدہ

يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ

لے لیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنے معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کریں گے یا (ویسے ہی) اللہ تعالیٰ کے ذمہ ایسی بات لگاتے ہو جس کی کوئی علمی سند اپنے پاس نہیں رکھتے۔ کیوں نہیں جو شخص قصداً بری باتیں کرتا رہے اور اس کو اس کی

أَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَأُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُونَ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

خطا (اور قصور اس طرح) احاطہ کرلے (کہ کہیں نیکی کا اثر تک نہ رہے) سو ایسے لوگ اہل دوزخ ہوتے ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ (ہمیشہ) رہیں گے۔ اور جو لوگ (اللہ اور رسول پر)

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ أُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُونَ ۝

ایمان لاویں اور نیک عمل کریں ایسے لوگ اہل بہشت ہوتے ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

بے بنیاد دعوی

"وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً" یعنی یہودی کہتے ہیں کہ آگ (دوزخ کی) ہمارے جسم کو چھوئے گی بھی نہیں۔ اور نہ اس میں ہم داخل ہوں گے بجز چند گنے چنے دنوں کے۔" "ایام" (دن) کی صفت "مَعْدُودَةً" (گنے چنے) اس لئے لائے اور ان چند گنے چنے دنوں کی تعیین اس لئے نہیں کی کہ اللہ تعالیٰ ان آیات میں یہودیوں کے متعلق خبر دے رہا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ دوزخ میں وہ چند متعین دن ہی رہیں گے، یہودیوں کے یہاں ان دنوں کی مدت جانی پہچانی تھی کہ کتنے دن انھیں دوزخ میں رہنا ہوگا، اس لئے ان کی تعیین اللہ تعالیٰ نے نہیں کی کہ وہ خود ہی سمجھ جائیں گے۔ بعد میں مفسرین کے اس سلسلے میں کئی اقوال نقل ہوئے ہیں کہ یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق وہ کتنے دن تھے جن کے متعلق وہ سمجھتے تھے کہ انھیں ان میں دوزخ میں رہنا پڑے گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تذکرہ اللہ کے دشمن یہودیوں کا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالےٰ عذاب صرف قسم پوری کرنے کے لئے دے گا اور ہم جہنم میں صرف اتنے ہی دنوں کے لئے جائیں گے جتنے دن ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ان کے آباء واجداد نے) گوسالہ پرستی کی تھی، یعنی چالیس دن کے لئے۔ جب یہ چالیس دن پورے ہوجائیں گے تو ہم پرسے عذاب بھی ختم ہوجائے گا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح روایت ہے سدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہودی کہتے تھے کہ ہم پر صرف چالیس دن کے لئے عذاب ہوگا، پھر جب آگ ہمارے گناہوں کو کھاجائے گی اور ہمیں پاک وصاف کردے گی تو ایک پکارنے والا پکارے گا کہ بنی اسرائیل کے اولاد کے ہر اس شخص کو جس نے ختنہ کرایا ہے نکال لو۔ اسی لئے ہمیں حکم ہوا ہے کہ ہم ختنہ کرائیں، ان کا عقیدہ تھا کہ چالیس دن کے بعد یہودیوں کو دوزخ سے نکال لیا جائے گا۔ ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہودی کہتے تھے کہ ہمارے رب نے ہماری ایک لغزش (گوسالہ پرستی) کے سلسلے میں ہم پر عتاب کیا اور قسم کھائی کہ چالیس دن تک ہمیں عذاب دے گا۔ پھر اس کے بعد ہمیں عذاب سے نکال لے گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری روایت میں منقول ہے کہ یہودی توریت میں یہ لکھا ہوا پاتے تھے کہ جہنم کے دونوں

Marfat.com

کناروں کی مسافت چالیس سال کی ہے، اور اس کے اندر ایک درخت اگا ہوا ہے جسے "شَجَرَۃُ الزَّقُّوْم" کہتے ہیں جب بنی اسرائیل اس درخت تک پہنچ جائیں گے (تو انھیں جہنم سے نکال لیا جائے گا) ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ "جہنم" دوزخ کو کہتے ہیں اور اس کے اندر "شجرۃ الزقوم" (تھوہر کا درخت) ہے۔ ان اللہ کے دشمنوں نے یہ سمجھ لیا کہ جہنم میں رہنے کے جو گنے چنے دن یہ اپنی کتاب میں پاتے ہیں ان میں اس درخت تک کی مسافت یہ طے کر لیں گے جو جہنم کے اندر ہوگا، پھر جب متعینہ دن جہنم کے اندر پورے ہو جائیں گے تو ان پر سے عذاب بھی ختم ہو جائے گا اور جہنم بھی ختم ہو جائے گی۔ ان کے اس عقیدہ کی طرف اشارہ "لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً" میں کیا گیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب وہ جہنم کے دروازے سے داخل ہوں گے تو ان پر عذاب شروع ہو جائے گا، پھر جب اپنے گمان و خیال کے مطابق عذاب کے چند گنے چنے دن کے آخر میں "شجرۃ الزقوم" تک پہنچیں گے تو جہنم کے داروغے ان سے پوچھیں گے کہ تم تو یہ سمجھتے تھے کہ عذاب تمہیں صرف چند گنے چنے دن ہی میں ہوگا اور اس کے بعد تم نجات پا جاؤ گے، لیکن اب وہ دن پورے بھی ہو گئے اور تمہیں جہنم میں ہمیشہ کے لئے رہنا ہے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حجت کرنے لگے اور کہنے لگے کہ ہم تو صرف چالیس دن کے لئے جہنم میں جائیں گے، اس کے بعد ہمیں وہاں سے نکال لیا جائے گا اور دوسرے لوگ ہماری جگہ جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے، ان کا اشارہ (نعوذ باللہ) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی طرف تھا۔ اس پر حضور اکرم نے ان کے سروں کی طرف اپنے دست مبارک سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم غلط کہتے ہو تم جہنم میں ہمیشہ کے لئے ڈالے جاؤ گے اور تمہاری جگہ پر کوئی دوسرا جہنم میں نہیں جائے گا۔ حضور اکرم کی یہ حدیث کئی روایتوں میں نقل ہوئی ہے۔ عذاب آخرت سے متعلق یہودیوں کے عقیدہ کے سلسلے میں دوسرا قول ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ ہے کہ یہودی کہتے تھے کہ دنیا کی مدت سات ہزار سال ہے، اور ہر ہزار سال کے بدلے میں اللہ تعالیٰ آخرت میں انہیں صرف ایک دن عذاب دے گا، اس طرح صرف سات دن آخرت میں اللہ تعالیٰ عذاب دے گا، ان کے اس عقیدہ کی تردید کے لئے یہ آیت نازل ہوئی کہ "وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً" مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی قول نقل ہوا ہے۔

"قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰہِ عَھْدًا فَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰہُ عَھْدَہٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" (آپ کہئے کیا تم اللہ تعالیٰ کے یہاں سے کوئی وعدہ پا چکے ہو، جو اللہ اب اپنے وعدہ کے خلاف نہ کرے گا؟ یا یونہی اللہ پر وہ جوڑ رہے ہو جس کا تم علم نہیں رکھتے) یہودیوں نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ انہیں دوزخ میں صرف چند گنے چنے دنوں کے لئے ڈالا جائے گا اور پھر مدت متعینہ کے ختم ہونے پر انہیں اس سے نکال لیا جائے گا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اس کے متعلق انسے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پوچھوا تا ہے کہ تم جو اس طرح بڑھ چڑھ کے دعویٰ کر رہے ہو تو کیا اللہ تعالیٰ نے تم سے اس سلسلے میں کوئی وعدہ کیا تھا کہ اللہ اب اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرے گا یا تم ہی اپنی طرف سے اللہ پر اپنی جہالت اور بے جا جرأت کی وجہ سے جوڑتے ہو۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے "اتخذ تم عند اللّٰہ عھدًا" کی تفسیر میں روایت ہے کہ کیا تم جو دعویٰ کر رہے ہو اس پر اللہ کے یہاں سے تم کوئی وعدہ پا چکے ہو، کوئی اس کی دلیل تمہارے پاس ہے؟ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی تفسیر مروی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ اگر تم نے لا الٰہ الا اللہ کہا ہوتا اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہوتا، پھر اسی پر تمہاری موت ہو جاتی تو میرا جیسا کہ تم سے وعدہ تھا کہ میں تمہیں اس پر ثواب دوں گا۔ تمہارا یہ عقیدہ یقیناً تمہارے لئے ذخیرۂ آخرت بنتا۔ لیکن کیا تم نے اپنا یہ عقیدہ باقی رکھا؟ کیا تم میرے ساتھ شرک و کفر سے باز آئے؟ اگر تم نے اپنا عقیدہ میرے کہنے کے مطابق رکھا ہوتا تو واقعی تمہیں اس دعوے کا حق تھا، لیکن تم نے ایسا نہیں کیا بلکہ میرے ساتھ شرک و کفر کیا تو پھر اب اللہ کی طرف وہ باتیں کیوں منسوب کرتے ہو جن کا تمہیں علم نہیں ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے انھیں یہودیوں کے متعلق فرمایا ہے کہ "اتخذ تم عند اللّٰہ عھدًا" (کیا تم اللہ کے یہاں سے کوئی وعدہ پا چکے ہو؟) دوسرے موقعہ پر یہی مضمون ایک اور انداز میں بیان ہوا ہے۔ "وَغَرَّھُمْ فِیْ دِیْنِھِمْ مَّا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ" (اور جو کچھ تراشتے رہتے ہیں اس نے انھیں دھوکے میں ڈال

Marfat.com

رکھا ہے) اور آیت "بلیٰ من کسب سیئۃً" (جو اس کے بعد آ رہی ہے) میں جزا اور سزا کا اصل قانون بیان ہوا ہے (کہ ثواب نیکی پر اور عذاب برائی پر ہوتا ہے) ان تمام اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ اپنے تمام بندوں سے کیا ہے (بنی اسرائیل کی اس میں کوئی خصوصیت نہیں) وہ یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے گا اور اس کے حکم کی اطاعت کرے گا وہ قیامت کے دن اس کے عذاب سے نجات پائے گا، ایمان سے مراد لا الٰہ الا اللہ کا اقرار ہے اور اللہ تعالیٰ کا سب سے یہ وعدہ ہے کہ جو شخص بھی اپنا یہ عمل قیامت کے دن لیکر حاضر ہوگا۔ اسے وہ ضرور نجات دے گا۔ آیت کی تفسیر میں ہم نے جتنے بھی اقوال نقل کئے ہیں۔ اگرچہ الفاظ مختلف ہیں لیکن مفہوم اور مطلب سب کا ایک ہے۔

قانون جزاء وسزا

"بلیٰ من کسب سیئۃً" (بلکہ اصل یہ ہے کہ جو کوئی بھی برائی اختیار کرے گا) اب اللہ تعالیٰ ان یہودیوں کی تردید کرتا ہے جو یہ کہتے تھے کہ ہم جہنم میں صرف چند گنے چنے دنوں کے لئے داخل کئے جائیں گے اور فرماتا ہے کہ جزا اور سزا کا اصل قانون یہ ہے کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلاتا ہے اور اس کا گناہ اسے گھیرے رہتا ہے تو ایسے لوگ جہنم میں ہمیشہ کے لئے ڈال دیئے جائیں گے اس کے برعکس جنت میں صرف وہی لوگ داخل کئے جائیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہوں گے، جنہوں نے اللہ کی طاعت کی ہوگی اور اس کے حدود کو قائم کیا ہوگا۔ آیت کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "جس نے تمہاری طرح اعمال کئے اور تمہاری طرح کفر کیا، یہاں تک کہ اس کا کفر اس کی اچھائی پر محیط ہوگیا تو یہی لوگ اہل جہنم ہیں، وہ اسمیں ہمیشہ رہیں گے آپ نے فرمایا کہ کلمہ "بلیٰ" کلام منفی کے جواب میں بولا جائے تو اس کے انکار اور اس کے بعد آنے والے کلام کے اقرار کیلئے ہوتا ہے، جس طرح کلام مثبت کے جواب میں کلمہ "نعم" کا مطلب اقرار و اثبات ہوتا ہے اور "سیئۃ" سے آیت میں مراد "اللہ کے ساتھ شرک" ہے، ابو وائل، مجاہد، قتادہ اور ربیع رحمہم اللہ سے "سیئۃ" کا مفہوم شرک نقل ہوا ہے، سدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "سیئۃ" وہ گناہ ہے جسکا بدلہ ہے اللہ تعالیٰ کے یہاں جہنم ہے۔ "سیئۃ" کا اصل مفہوم عام ہے یعنی ہر برائی اور گناہ کو کہہ سکتے ہیں۔ آیت میں بظاہر اس کی کوئی تخصیص بھی معلوم ہوتی کہ اس سے کوئی خاص گناہ ہی مراد لیا جائے۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے آیت میں جس "سیئۃ" کا ذکر کیا ہے اس کا بدلہ "جہنم میں ہمیشہ رہنا" بھی بتا دیا ہے، اس لئے یہی کہا جائے گا کہ یہاں "سیئۃ" سے مراد خاص گناہ ہے، کیونکہ ہر گناہ کی سزا جہنم میں ہمیشہ کے لئے رہنا" نہیں ہوتی، بلکہ صرف شرک و کفر ہی پر اس سزا کی وعید اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متواتر احادیث سے یہ ثابت ہے کہ اہل ایمان کو جہنم میں ہمیشہ کیلئے رہنا نہیں ہوگا۔ آیت اگر پوری آپ پڑھ لیں، اسی سے ہمارے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے ارشاد ہے "بلکہ اصل یہ ہے کہ جو کوئی بھی بدی اختیار کرلے گا اور اس کا گناہ اس کو گھیرے گا تو یہی لوگ اہل دوزخ ہیں اور جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں تو یہی لوگ اہل جنت ہیں"، تمام اسلاف صحابہ اور تابعین کا اسپر اتفاق رہا ہے کہ آیت میں "سیئۃ" سے مراد عام نہیں ہے، بلکہ خاص کفر و شرک مراد ہے۔ اس لئے اس میں عام "گناہ کبیرہ" کو بھی داخل کرکے اس کے مرتکب کو بھی اسی سزا کی وعید غلط اور امت کے اجماع کے خلاف ہوگی۔ اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں متواتر طریقوں سے ثابت ہے کہ گناہ کبیرہ کے مرتکب مسلمان ہمیشہ کے لئے جہنم میں نہیں بھیجے جائیں گے حضور اکرم کی یہ احادیث اتنی روایتوں سے ثابت ہیں اور صحابہ، تابعین اور اس کے بعد کے تمام علماء و صلحاء نے اتنی کثرت کے ساتھ اس سلسلے کی احادیث کو نقل کیا ہے کہ ان احادیث کے آنحضور سے ثابت ہونے کا انکار کسی شخص کے لئے ممکن نہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے بیان و شرح کا حق دیا تھا اور شریعت میں آپ ہی کا بیان حجت اور دلیل ہے، اس لئے آپ سے منقول ان متواتر احادیث کی روشنی میں یہی فیصلہ کیا جائے گا کہ "سیئۃ" سے مراد خاص گناہ یعنی کفر و شرک ہے اور "کبائر" کا مرتکب ہمیشہ کے لئے جہنم میں نہیں داخل ہوگا۔ "واحاطت بہ خطیئتہ" یعنی اس کے گناہ نے اسے گھیرے رکھا اور توبہ اور رجوع سے پہلے اس کی موت واقع ہوگئی۔ کسی چیز کے "احاطۃ" کا مطلب ہوتا ہے اس کو گھیرے رکھنا، جس طرح دیوار (حائط) کے ذریعہ گھر کو گھیرے میں لے لیا جاتا ہے اور اس طرح اس کی حفاظت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد "انا اعتدنا للظلمین نارا احاط بہم سرادقہا" (ہم نے ظالموں کے لئے آگ تیار کر رکھی ہے اس کی قناتیں ان کو گھیرے ہوں گی) میں بھی "احاط" کا یہی مفہوم ہے۔ آیت

Marfat.com

کا مطلب یہ ہوگا کہ جس نے اللہ کے ساتھ شریک ٹھیرایا اور خوب دل کھول کر گناہ کئے اور توبہ کے بغیر اسی حالت میں مرگیا تو ایسے لوگ اہل جہنم ہیں، انھیں اس میں ہمیشہ رہنا ہوگا۔ ابو رزین، اعمش، سدی، ضحاک اور ربیع بن خثیم رحمہم اللہ سے روایت ہے کہ "اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ" کا مطلب ہے کہ اپنے اسی گناہ پر مرگیا اور توبہ نہیں کی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یعنی اس کی اچھائی کے مقابلہ میں اس کا کفر اس پر محیط رہا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "خطیئۃ" سے مراد وہ گناہ ہیں جنکے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے جہنم کو اس کے لئے ضروری قرار دیا ہے قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے گناہ کبیرہ اس کی تفسیر منقول ہے۔ کسی نے حسن رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ "خَطِيْئَة" کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ ہر بات جس پر اللہ تعالیٰ نے جہنم کی وعید کی ہے "خَطِيْئَة" ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مراد شرک ہے۔ "فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ" یعنی جن لوگوں نے برائی اختیار کی اور ان کے گناہ نے انھیں گھیرے رکھا تو یہ لوگ اہل جہنم ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے "اَصْحٰبُ النَّارِ" (اہل جہنم) بنایا، کیونکہ جس طرح کسی شخص کا دوست ساتھی (صاحب) دوسروں کی صحبت کے مقابلہ میں اپنے ساتھی کی صحبت اور اس کی ہمنشینی کو ترجیح دیتا ہے۔ اور اس کے ساتھی کی حیثیت سے لوگوں میں جانا پہچانا جاتا ہے اسی طرح ان لوگوں نے بھی جنت کے مقابلہ میں جہنم کے اعمال کو ترجیح دی، اس لئے یہ لوگ بھی "اصحاب النار" (جہنم کے ساتھی) ہوئے اور انھیں بھی اسی نام سے متعارف ہونا چاہیئے۔ "هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ" یعنی وہ لوگ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے، وہی ان کی قیام گاہ ہوگی۔ ابن عباس اور سدی رضی اللہ عنہما سے یہی روایت ہے۔ "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ" والذین آمنوا یعنی جن لوگوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی تصدیق کی "وعملوا الصالحات" یعنی اور اللہ کی اطاعت کی، اس کے حدود کو قائم رکھا، اس کے فرائض ادا کئے اور اس کی حرام کی ہوئی چیزوں سے پرہیز کیا "فاولئک" یعنی پس جن لوگوں کے یہ اوصاف ہیں "اصحاب الجنۃ هم فیها خالدون" وہی لوگ اہل جنت ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے وہی ان کی ہمیشہ کے لئے قیام گاہ ہوگی۔ یہ اور اس سے پہلے کی آیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی اطلاع ہے کہ جنت اور جہنم اور اس میں جو لوگ بھیجے جائیں گے وہ سب ہمیشہ رہیں گے۔ انہیں کبھی فنا نہیں ہونا ہے۔ ان آیات میں یہود کے اس دعویٰ کو رد کیا گیا ہے کہ وہ جنت میں صرف چند دنوں کے لئے ڈالے جائیں گے اور پھر اس کے بعد انہیں جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں متنبہ کیا کہ اگر وہ اپنے کفر پر قائم رہے تو جہنم میں انہیں ہمیشہ رہنا ہوگا، اس سے وہ کبھی نہیں نکل سکتے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آیت سے مراد یہ ہے کہ (اے بنی اسرائیل) جو لوگ ان چیزوں پر ایمان لائے جس کا تم نے کفر کیا اور وہ کام کئے جنھیں تم نے چھوڑ دیا تھا تو انہیں جنت ملے گی اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس سے مراد صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۭ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب لیا ہم نے (توریت میں) قول و قرار بنی اسرائیل سے کہ عبادت مت کرنا (کسی کی) بجز اللہ تعالیٰ کے اور ماں باپ کی (بھی) طرح خدمت گذاری کرنا اور اہل قرابت کے

وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ

بھی اور بے باپ کے بچوں کی بھی اور غریب محتاجوں کی بھی اور عام لوگوں سے بات اچھی طرح (خوش خلقی سے) کہنا اور پابندی رکھنا نماز کی اور ادا کرنے رہنا زکوٰۃ پھر تم (قول و قرار

وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝

کرکے) اس سے پھر گئے بجز معدودے چند کے اور تمہاری تو معمولی عادت ہے اقرار کرکے ہٹ جانا۔

توحید اور عمل صالح کا عہد

"وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ" میثاق کا مفہوم ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے یہودیو! وہ وقت بھی یاد کرو جب ہم نے

Marfat.com

تم سے عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اسی طرح آیت کا مفہوم منقول ہے علمار قرارت کے اس سلسلے میں اقوال مختلف ہیں کہ آیت میں "لَا تَعْبُدُوْنَ" تا کے ساتھ ہے یا "لَا یَعْبُدُوْنَ" یا کے ساتھ ہے۔ دونوں کا مفہوم ایک ہے اور میری رائے میں دونوں طرح قرارت جائز ہے۔ بصرہ کے بعض نحویوں نے کہا ہے کہ آیت میں واقعہ کی نقل وحکایت ہوئی ہے۔ جیسے کہتے ہیں کہ "اِسْتَحْلَفْنَاھُمْ لَا تَعْبُدُوْنَ" یعنی ہم نے اُن سے کہا کہ خدا کو گواہ بنا کر کہو کہ تم عبادت نہیں کرو گے۔ اسی طرح آیت میں بھی عہد لینے کے واقعہ کو نقل کیا گیا ہے۔ یہ تفسیر ہماری بیان کردہ تفسیر سے قریب ہے۔ ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ان سے عہد لیا گیا تھا کہ خالص اللہ کی عبادت کریں گے اور اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہیں کریں گے۔ ربیع اور ابن جریج رحمہما اللہ سے اسی کے مطابق تفسیر منقول ہے۔ "وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا" اس سے پہلی آیت میں "لا تعبدون" سے پہلے قاعدہ کے مطابق "اَنْ" محذوف تھا اور "وبالوالدین احسانا" کا اس پر عطف ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا۔ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرنے کا، اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کا۔ "اِحْسَانًا" کو نصب ایک فعل کی وجہ سے ہے جو عبارت میں مقدر ہے، چونکہ "بالوالدین" سے اس فعل کا مفہوم خود سمجھ میں آجاتا تھا اس لئے اس کے ذکر کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اصل عبارت اس طرح ہوتی "بِاَنْ تُحْسِنُوْا اِلَی الْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا" اس کے علاوہ تقدیر کلام دوسرے طریقوں سے بھی بیان کی گئی ہے۔ "اِحْسَانًا" جس کا بنی اسرائیل کو والدین کے ساتھ کرنے کا حکم دیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے۔ ان کے لئے اچھی بات زبان سے نکالی جائے، ان کی اطاعت وفرمانبرداری کی جائے، ان کی دلداری کا پورا خیال ہو، ان کے ساتھ ہر معاملہ میں نرمی اور لچک ہو انکے لئے دعائے خیر کی جاتی رہے اور اس کے علاوہ جتنی بھی اس ذیل کی مناسب چیزیں ہو سکتی ہیں اور جن کے اختیار کرنے کو اللہ تعالےٰ نے پسندیدہ قرار دیا ہے ان سب کا مظاہرہ ان کے لئے کیا جائے۔ "وَذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتَامٰی وَالْمَسَاکِیْنَ" (اور قرابت داروں اور یتیموں اور محتاجوں سے (بھی حسن سلوک سے پیش آنے کا) "ذِی الْقُرْبٰی" یعنی جو رشتہ دار ہیں ان کی قرابت کا حق ادا کیا جائے اور ان کے ساتھ صلۂ رحمی کا معاملہ کیا جائے۔ "قُرْبٰی" فُعْلٰی کے وزن پر مصدر ہے۔ "اَلْیَتَامٰی" یتیم کی جمع ہے جیسے اسیر کی جمع اَسَارٰی آتی ہے۔ اس میں بچے بچیاں سب آجاتی ہیں۔ یعنی ہم نے یتیموں کے ساتھ بھی تمہیں رحمت وشفقت کے معاملہ کا حکم دیا تھا۔ "وَالْمَسَاکِیْنَ" یعنی ہم نے تمہیں اس کا بھی حکم دیا تھا کہ مسکینوں کا جو حق اللہ تعالےٰ نے تمہارے مال میں ضروری قرار دیا ہے وہ تم ادا کرتے رہو گے۔ یہ "مسکین" کی جمع ہے، ایسے شخص کو کہتے ہیں جو فاقہ اور ضرورت کی وجہ سے جھکا گرا ہوا ہو۔ مِفْعِیْل کے وزن پر "مَسْکَنَۃٌ" سے نکلا ہے۔ "وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا" اور (اس کا عہد لیا تھا کہ) لوگوں سے بھلی بات کہنا) اس آیت کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مذکورہ بالا تمام اچھی عادات کے ساتھ انہیں اس کا بھی اللہ تعالےٰ نے حکم دیا کہ عام لوگوں سے بھی بھلی بات کہیں، یعنی جو لوگ کلمہ توحید کا اقرار نہیں کرتے اور اس سے اعراض کرتے ہیں انہیں اس کی طرف رغبت دلائیں۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بھلی بات اور نرم گفتگو بھی سالکنگی ہے، عمدہ اخلاق کا مظہر ہے اور اس سے اللہ تعالےٰ راضی ہوتا ہے اور پسند کرتا ہے۔ ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ "لوگوں سے بھلی بات کہو"۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "لوگوں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں سچی بات کہو" اس کا انہیں حکم ہوا تھا۔ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ نیک کاموں کی طرف لوگوں کو رغبت دلانے اور برے کاموں سے روکنے کے لئے اس آیت میں کہا گیا ہے۔ عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اس سے بھلی بات مراد ہے۔ "وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" یعنی نماز کے سلسلے میں جو حقوق تم پر واجب ہیں ان سب کی رعایت کے ساتھ اسے ادا کرنا۔ چنانچہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "اقامت صلوٰۃ" یہ ہے کہ نماز میں رکوع سجدہ، تلاوت کلام اللہ، خشوع اور اللہ تعالےٰ کی طرف پوری توجہ کے ساتھ نماز ادا کی جائے۔ "وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ" (اور زکاۃ دیتے رہنا) "زکاۃ" کا مفہوم اس سے پہلے گذر چکا ہے، جس زکاۃ کا بنی اسرائیل کو حکم ہوا تھا اور جس کا ذکر اس آیت میں ہوا ہے اس کے متعلق ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس سے مراد وہ فریضہ ہے جو اللہ تعالےٰ نے ان کے مال پر عائد کیا تھا۔ ان کے یہاں

Marfat.com

اس کا طریقہ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے طریقہ سے مختلف تھا۔ وہ اپنی زکاۃ نذر کے طریقہ پر رکھ دیتے تھے، پھر ایک آگ اترتی اور اسے اٹھالے جاتی۔ اس سے یہ سمجھا جاتا کہ اللہ تعالےٰ نے اسے قبول کرلیا ہے۔ لیکن جس زکاۃ کو آگ نہ اٹھالے جاتی وہ غیر مقبول ہوتی تھی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے ایک دوسری روایت میں ہے کہ آیت میں زکاۃ سے مراد اللہ کی طاعت اور اخلاص ہے۔

اس سے بھی پھر گئے

"ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ" (پھر بجز معدودے چند کے تم سب ان احکام سے پھر گئے اور تم ہو بھی اعراض کرنے والے) یہ انہیں یہود بنی اسرائیل کے متعلق اطلاع ہے کہ انہوں نے اس عہد و میثاق کو توڑ دیا جو اللہ تعالےٰ نے ان سے لیا تھا کہ غیر اللہ کی عبادت نہ کریں، والدین کے ساتھ حسن معاملت اختیار کریں، صلہ رحمی کریں، یتیموں کے ساتھ نرم خوئی اختیار کریں، مسکینوں کا حق ادا کریں، اللہ کے دوسرے بندوں کو بھی ان اعمال کی ترغیب دیں جنکا اللہ نے انھیں حکم دیا ہے، اس کی طاعت و عبادت پر لوگوں کو ابھاریں، نماز کو اس کے حدود کی پوری رعایت کے ساتھ قائم کریں، اس کے فرائض بجا لائیں اور اپنے مال کی زکات نکالیں۔ لیکن انہوں نے اس کے ان تمام احکام کے خلاف عمل کیا اور اللہ کے بتلائے ہوئے طریقہ سے اعراض اور سرکشی کی، ہاں معدودے چند لوگ ان میں سے اس نافرمانی اور سرکشی سے بچ گئے اور انہوں نے اللہ کے عہد و میثاق کو پورا کیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی تفسیر منقول ہے، آپ نے فرمایا کہ انہوں نے اللہ تعالےٰ کے احکام کو استخفافاً چھوڑا تھا بعض مفسرین کا خیال ہے کہ "وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ" (اور تم ہو ہی اعراض کرنے والے) سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودی ہیں، اور اس سے پہلے کی تمام آیات سے مراد ان کے اسلاف اور آباء و اجداد ہیں، اس تفسیر کی بنیاد پر "ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ" کا مطلب تو یہ ہوگا کہ "پھر تمہارے اسلاف نے اعراض کیا، بجز معدودے چند کے" لیکن یہاں بھی ظاہری خطاب انھیں یہودیوں سے ہو رہا ہے جو حضور اکرم کے زمانہ میں موجود تھے اور اس کی وجہ وہی ہے جو ہم اس ذیل کی آیات کی تفسیر میں بیان کرچکے ہیں۔ پھر اس کے بعد حقیقی خطاب حضور اکرم کے زمانہ کے یہودیوں سے کیا اور فرمایا کہ اے وہ بنی اسرائیل جو ایسے کردار کے حامل اسلاف کی اولاد ہو، تم بھی انہیں کی طرح اللہ کے عہد و میثاق سے اعراض کرنے والے ہو اور انھیں کی طرح سرکش ہو۔ بعض دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ "ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ" (پھر بجز معدودے چند کے تم سب ان احکام سے پھر گئے اور تم ہو بھی اعراض کرنے والے) پوری آیت ان یہودیوں کے بارے میں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے ان کی عہد شکنی، معصیت کوشی اور اللہ کے حکم میں تحریف و تبدیلی کی مذمت کی جارہی ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ

اور (وہ) زمانہ بھی یاد کرو جب ہم نے تم سے قول و قرار (لیا) کہ باہم خونریزی مت کرنا اور ایک دوسرے کو ترک وطن مت کرانا پھر تم نے اقرار بھی کرلیا، اور (اقرار بھی ضمناً نہیں بلکہ

ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ○ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ

ایسا صریح جیسے) تم شہادت دیتے ہو۔ پھر (اس صریح اقرار کے بعد) تم جیسے ہو (یہ آنکھوں کے سامنے موجود ہی) ہو کہ باہم قتل و قتال بھی کرتے

تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ط

ہو اور ایک دوسرے کو ترک وطن بھی کراتے ہو ان اپنوں کے مقابلہ میں (انکی مخالف قوموں کی) امداد کرتے ہو گناہ اور ظلم کے ساتھ

وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ

اور اگر ان لوگوں میں سے کوئی گرفتار ہوکر تم تک پہنچ جاتا ہے تو ایسوں کو کچھ خرچ کرا کے رہا کرادیتے ہو حالانکہ یہ بات (بھی معلوم ہی) کہ تمکو ان کا ترک وطن کرا دینا نیز ممنوع ہے

Marfat.com

بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ

کیا تو (بس یوں کہو کہ) کتاب (توریت) کے بعض (احکام) پر تم ایمان رکھتے ہو اور بعض پر ایمان نہیں رکھتے سو اور کیا سزا ہونی چاہیئے ایسے شخص کی جو تم لوگوں میں سے ایسی حرکت کرے بجز (اسکے کہ) رسوائی ہو دنیوی

فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ

زندگانی میں اور روز قیامت کو بڑے سخت عذاب میں ڈال دیئے جاویں اور اللہ تعالیٰ (کچھ) بے خبر نہیں ہیں تمہارے

عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۡ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ

اعمال سے یہ ایسے لوگ ہیں کہ انہوں نے احکام کی مخالفت کر کے دنیوی زندگانی (کے حظوظ) کو لے لیا ہے بعوض (نجات) آخرت کے سو نہ (بجز کفر سے) انکی سزا میں (کچھ) تخفیف دی

الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝

جاوے گی۔ اور نہ کوئی اُن کی طرف داری و پیروی کرنے پاوے گا۔

ایک اور عہد اور اس کی خلاف ورزی

"وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ" (اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ اپنوں کا خون نہ بہانا اور اپنے لوگوں کو اپنے وطن سے مت نکالنا) "وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ" مفہوم اور اعراب ہر حیثیت سے "وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ" کی طرح ہے۔ "سفک دم" (تسفکون دماءکم) کا معنی ہے خون بہانا، خونریزی کرنا۔ آیت میں انہیں آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرنے کی ممانعت سے متعلق عہد کا ذکر ہے۔ انھیں اس سے روکا گیا تھا کہ خود ہی اپنے آدمی کو قتل نہ کریں، کیونکہ اپنے ہی مذہب اور اپنے ہی دین کے آدمی کو قتل کرنا خود سے اپنی جان لے لینے کے مترادف تھا کہ جب دونوں کا مذہب ایک تھا تو گویا وہ ایک جسم اور ایک فرد کی طرح تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مسلمانوں کو اس طرف توجہ دلائی ہے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان آپس میں رحم اور نرمی کا معاملہ اختیار کرنے میں ایک جسم کی طرح ہیں، جسم کے کسی بھی حصہ میں اگر تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم تکلیف محسوس کرتا ہے۔ اس آیت کا یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ تم اپنے ہی مذہب و ملت کے آدمی کو قتل نہ کرو کہ اس کے بدلہ میں قصاص کے طور پر تمہیں بھی قتل کیا جائے گا اور اس طرح گویا تم نے اسے قتل کر کے خود اپنی جان ضائع کر لی۔ قتادہ اور ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہما نے آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ (ہم نے تم سے اس کا عہد لیا تھا کہ) "ناحق آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرنا اور اپنے ہی لوگوں کو اپنے دیار سے نہ نکالنا" "ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ" یعنی پھر تم نے اس مذکورہ بالا عہد میثاق کا اقرار کیا۔ ابوالعالیہ اور ربیع رحمہا اللہ سے یہی مفہوم نقل ہوا ہے۔ "وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ" (اور تم گواہ ہو) اس کی تفسیر میں ائمہ مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ خطاب ان یہودیوں سے براہ راست ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے زمانہ میں مدینہ منورہ میں موجود تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں تنبیہ کرتا ہے کہ توریت تمہارے پاس موجود ہے، تمہارے اسلاف نے اس عہد کا اقرار کیا تھا کہ اپنے ہی لوگوں کا خون نہیں بہانا ہے اور اپنے ہی ملت والوں کو اپنے وطن سے نہیں نکالنا ہے اور تم ان کے اس اقرار پر گواہ ہو، لیکن پھر بھی تم توریت کے ان احکام کو ضائع کر رہے ہو اور ان کی خلاف ورزی کرتے ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی مفہوم نقل ہوا ہے، لیکن ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ "وانتم تشہدون" بھی حضور اکرم کے زمانہ کے یہودیوں کے اسلاف کے متعلق خبر ہے، مفہوم ہے، "وَاَنْتُمْ شُهُوْدٌ" (یعنی اس واقعہ کے وقت تم وہاں موجود تھے) جس طرح پچھلی آیات میں ان کے اسلاف کے واقعات کو بیان کرتے وقت خطاب انھیں یہودیوں سے کیا گیا ہے وہی صورت یہاں بھی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک بہتر تفسیر یہ ہے کہ "وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ" میں خبر تو ان کے اسلاف ہی کی ہو لیکن حضور اکرم کے زمانہ کے یہودی بھی اس میں شامل ہوں جنسے قرآن مجید کا براہ راست خطاب ہے۔ "وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ" (اور جب ہم نے تم سے عہد لیا) میں بھی یہی صورت ہے، کیونکہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے

Marfat.com

نے براہ راست عہد تو انھیں بنی اسرائیل سے لیا تھا جو رسول اللہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں موجود تھے لیکن توریت کے حکم کے مطابق اس عہد پر عمل اس کے بعد آنے والے ہر زمانہ کے یہودیوں کے لئے ضروری تھا پھر "ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ" سے یہودیوں کو جو ان آیات کے براہ راست مخاطب ہیں انکی اور ان کے اسلاف کی عہد شکنی پر تنبیہ کی جا رہی ہے کہ جس عہد پر عمل تمہارے لئے ضروری تھا تم نے اسے توڑا اور اس کے خلاف عمل کیا، اصل میں جس عہد و میثاق کا ذکر چل رہا ہے اس پر عمل جس طرح موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے یہودیوں پر ضروری تھا اسی طرح آپ کے بعد آنے والے ہر زمانہ کے یہودیوں کے لئے اس پر عمل ضروری تھا، اللہ تعالےٰ نے آیت میں یہودیوں کے کسی خاص طبقہ کی تخصیص نہیں کی ہے بلکہ اس میں اس کی گنجائش ہے کہ ہر زمانہ کے یہودی اس سے مراد لئے جائیں، اس لئے مناسب نہیں ہے کہ آیت میں جو حکم عام ہے اسے بلا کسی دلیل کے کسی قسم کی تخصیص کی جائے اور کہا جائے کہ ان کا فلاں طبقہ مراد ہے اور فلاں مراد نہیں ہے۔ اس کے بعد جو آیت آ رہی ہے اس میں بھی یہی صورت ہے۔

"ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" (پھر تم ہی وہ ہو کہ اپنوں کو قتل بھی کرتے ہو اور اپنے ہی ایک گروہ کو ان کے وطن سے نکال بھی دیتے ہو، ان کے مقابلہ میں گناہ اور ظلم کے ساتھ (ان کے مخالفین کی) مدد بھی کرتے ہو)۔ "ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ" کی تفسیر دو طرح ہو سکتی ہے، ایک یہ کہ اصل میں آیت یوں تھی "ثُمَّ اَنْتُمْ يَا هٰٓؤُلَآءِ" یعنی پھر تم اے یہودیو! گویا آیت میں "یَا" (اے) حذف ہو گیا۔ قرآن مجید ہی میں ایک موقعہ پر "يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا" میں یہی صورت ہے، اصل میں یوں ہے "يَا يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا" (اے یوسف! اس سے اعراض کیجئے) دوسری تفسیر یہ ہے کہ اصل عبارت یوں تھی "ثُمَّ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ" (پھر تم ہی وہ قوم ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو) "تظاھر" (جس سے تظاھرون نکلا ہے) کے معنی تعاون کے ہیں، کیونکہ تعاون میں بھی ایک کو دوسرے کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے (لتقویۃ بعضھم ظھر بعض)

"وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ" کی تفسیر میں جس طرح مختلف اقوال تھے زیر تفسیر آیت میں بھی اسی کے مطابق اقوال کا اختلاف ہے ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "تم اپنوں کے مقابلہ میں ظلم و گناہ کے ساتھ مشرکین کی مدد کرتے ہو۔ اور اس طرح مشرکین کے ساتھ مل کر اپنوں کا خون بہاتے ہو اور انھیں ان کے وطن سے نکالتے ہو۔ آپ نے بیان فرمایا کہ توریت میں اللہ تعالےٰ نے ناحق اپنے آدمیوں کا خون بہانا ان پر حرام کیا تھا، اور ان پر فرض کیا تھا کہ اگر کوئی ان کا ہم مذہب قیدی ہو جائے تو فدیہ دیکر اسے چھڑائیں۔ مدینہ میں ان کی دو جماعتیں ہو گئی تھیں بنو قینقاع کے یہودی مشرکین مدینہ کے قبیلہ خزرج کے حلیف تھے اور بنو نضیر اور بنو قریظہ کے یہودی قبیلہ اوس کے حلیف تھے۔ جب کبھی مدینہ کے ان دونوں قبیلوں میں جنگ ہوتی تو اپنے معاہدہ کے مطابق بنو قینقاع، قبیلہ خزرج کا ساتھ دیتے اور بنو نضیر اور قریظہ قبیلہ اوس کا ساتھ دیتے اور اس طرح اپنے ہی ہم مذہبوں اور بھائیوں کے خلاف اپنے حلیفوں کی مدد کرتے اور اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے بھائیوں کو قتل کرتے، حالانکہ توریت ان کے پاس موجود تھی اس کے احکام، حلال و حرام سے یہ خوب واقف تھے۔ رہا قبیلہ اوس و خزرج کا معاملہ تو یہ تو مشرک تھے، بتوں کی پرستش کرتے تھے، نہ جنت سے واقف تھے اور نہ جہنم سے۔ بعث، قیامت، کتاب اور حلال و حرام کا ان کے یہاں کوئی تصور ہی نہیں تھا، لیکن یہودی تو ان سب چیزوں سے واقف تھے اور اہل کتاب ہونے کے دعویدار تھے۔ پھر جب جنگ بند ہو جاتی تو ان کے حلیفوں کے ہاتھ میں ان کے ہم مذہب مخالفوں میں سے جو جنگی قیدی لگتے انھیں اپنے پاس سے فدیہ دیکر چھڑا لیتے اور کہتے کہ توریت میں یہی حکم ہے، حالانکہ توریت میں اس کا بھی حکم تھا کہ اپنے ہم مذہبوں کو ناحق قتل نہ کریں، لیکن وہ ایک حکم پر عمل کرتے تھے اور دوسرے حکم کو چھوڑ دیتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ ان سے فرماتا ہے کہ "کیا تم کتاب کے ایک حصہ کو تو مانتے ہو اور ایک حصہ سے انکار کرتے ہو؟ یعنی اپنے ہم مذہبوں کو فدیہ دیکر چھڑا لیتے ہو اور کہتے ہو کہ توریت میں یہی حکم ہے، ٹھیک ہے، توریت میں واقعی یہی حکم ہے، لیکن اسی میں اس کا بھی تو حکم ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرو، تم اس پر کیوں عمل نہیں کرتے کیا تمہیں

Marfat.com

اس حکم سے انکار ہے؟ جہاں تک مجھے علم ہے اوس و خزرج کے ساتھ ملکر ان کے اسی طرزِ عمل کے متعلق قرآن مجید کی یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔ سُدّی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی آیت کا یہی شانِ نزول ذکر کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کے لئے تورات کے ذریعہ یہ ضروری قرار دیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کریں اور بنی اسرائیل کا جو فرد بھی غلام یا باندی کی حیثیت سے انھیں ملے اسے فوراً خرید کر آزاد کردیں، لیکن وہ اپنے حلیفوں کا ساتھ دیتے وقت لڑائی میں اپنے مخالف یہودیوں کو قتل کرتے تھے۔ پھر جب جنگی قیدی لائے جاتے تو سب ملجاتے اور فدیہ دے کر یہودی قیدیوں کو آزاد کرالیتے تھے۔ مشرکین عرب اس پر انھیں شرم دلاتے کہ آپس میں لڑتے ہو اور پھر جب قیدی آتے ہیں تو انہیں چھڑا لیتے ہو۔ یہودی کہتے کہ آپس میں جنگ کرنا ہمارے لئے حرام ہے اور قیدیوں کو چھڑانا فرض ہے اس لئے ہم اپنے یہودی قیدیوں کو چھڑا لیتے ہیں۔ عرب کہتے کہ پھر جنگ ہی کیوں کرتے ہو؟ اس کا جواب ان کے پاس یہ تھا کہ ہمیں غیرت آتی ہے کہ ہمارے حلیف کمزور پڑ جائیں اور انھیں جنگ میں شکست اٹھانی پڑے۔ اسی دورخے پن پر اللہ تعالےٰ نے آیات میں انھیں شرم دلائی ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ لیکن ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت ہے کہ بنی اسرائیل کی یہ روش تھی کہ جب کوئی قبیلہ ان کے یہاں کمزور پڑ جاتا تو اسے جلا وطن کر دیتے تھے حالانکہ ان سے عہد لیا گیا تھا کہ خون نہ بہائیں گے اور کسی کو اس کے وطن سے نہ نکالیں گے۔

"عُدْوَان" فُعْلَانٌ کے وزن پر "تَعَدِّیْ" سے نکلا ہے ظلم اور سرکشی میں کوئی اگر حد سے تجاوز کر جائے تو اس کے لئے بولتے ہیں۔

"وَإِن يَأْتُوكُمْ أُسَارَىٰ تُفَادُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ ۚ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ" (اور اگر وہ تم تک قیدی ہو کر پہنچتے ہیں تو تم انھیں فدیہ دیکر چھڑا لیتے ہو، حالانکہ ان کا وطن سے نکالنا ہی تم پر حرام تھا، تو کتاب کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور ایک حصہ سے انکار کرتے ہو) یعنی تم خوب جانتے ہو کہ جو تم نے عہد کیا تھا اس کے کسی حصہ سے بھی انکار اس عہد و میثاق کو توڑنا ہے جو تم نے مجھ سے کیا تھا، جس طرح تمہارا مجھ سے یہ عہد تھا کہ اپنے قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑا لو گے اسی طرح تم نے یہ بھی عہد کیا تھا کہ آپس میں ناحق ایک دوسرے کا خون نہ بہاؤ گے اور اپنے ہی آدمیوں کو اپنے وطن سے نہ نکالو گے، لیکن تم ایک پر تو عمل کرتے ہو اور ایک دوسرے حکم کو نظر انداز کر دیتے ہو، حالانکہ فرض ہونے کی حیثیت سے تمہارے لئے دونوں ہی حکم برابر تھے اور قتل اور جلا وطن کرنا بھی تم پر حرام تھا۔ اللہ کے احکام میں تم اپنی طرف سے فرق آخر کس بنیاد پر کرتے ہو؟ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ان کا اپنے آدمیوں کو ان کے وطن سے بے وطن کرنا کفر تھا اور اپنے قیدیوں کا فدیہ دے کر انھیں آزاد کرا لینا ایمان تھا جس کا آیت میں ذکر ہوا ہی ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی "افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض" کی تفسیر یہی منقول ہے۔ ابن جریج، مجاہد اور ابو العالیہ رحمہم اللہ سے بھی یہی نقل ہوا ہے۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی روایت ہے کہ عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ (جو ایمان لانے سے پہلے بنی اسرائیل کے بہت بڑے عالم مانے جاتے تھے) کوفہ میں جالوت کے پاس سے گذرے تو دیکھا کہ وہ یہودیوں کی انھیں قیدی عورتوں کا فدیہ دیکر انھیں چھڑا رہا تھا جن کے ساتھ عربوں نے ہم بستری نہیں کی تھی۔ لیکن جن کے ساتھ (باندی ہونے کے حق کی وجہ سے) ہم بستری کر لی تھی انھیں آزاد نہیں کرا رہا تھا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ تمہاری کتاب (توریت) میں تو یہ لکھا ہے کہ اپنے تمام قیدیوں کو فدیہ دیکر چھڑاؤ (اور تم صرف ایک خاص طبقہ کو آزاد کرا رہے ہو) یہ روایت میرے علم میں آئی ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بنی اسرائیل کے اس واقعہ کے ضمن میں فرمایا کہ بنی اسرائیل تو گذر چکے، اب اس آیت کے مصداق تم ہو۔[۱]

---

[۱] یعنی اگر تم بھی انھیں کی طرح کتاب اللہ یعنی قرآن مجید کے بعض احکام پر عمل کرو گے اور بعض احکام کو نظر انداز کر دو گے تو تم میں اور یہودیوں میں پھر فرق کیا باقی رہ جائے گا؟ یہودیوں کو تو جو کچھ کرنا تھا وہ کر گئے اب وہی روش تمہاری نہ ہونی چاہیے۔ (مترجم)

Marfat.com

" فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ". یعنی تم میں سے جو لوگ ایسا کرتے ہیں کہ آپس میں قتل و قتال کرکے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو توڑتے ہیں اور ظلم و گناہ پر اس درجہ جری ہو گئے ہیں کہ مشرکوں کی حمایت کے جذبہ میں اپنے ہی آدمیوں کو جلا وطن کر دیتے ہیں اس کی سزا دنیوی زندگی میں ذلت و رسوائی سے کم اور کیا ہو سکتی ہے؟ " جزاء " بمعنی بدلہ، ثواب یا سزا۔ "خِزْيٌ" بمعنی ذلت و حقارت۔ "فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا" یعنی اس دنیا میں، آخرت سے پہلے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا تھا کہ یہودیوں میں سے جو بھی کسی کو قتل کرے تو اسے پکڑو اگر مقتول کی قصاص میں اسے قتل کر دیا جائے اور ظالم سے مظلوم پر ظلم کا بدلہ لیا جائے، یہودیوں پر یہی ذلت کا عذاب تھا جس کی طرف اشارہ آیت کا لفظ "خِزْيٌ" (ذلت و رسوائی) کر رہا ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد جزیہ (لگان) ہے جو ان یہودیوں سے لیا جاتا ہے گا جو اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے اسلامی سلطنت کے حدود میں بود و باش اختیار کریں گے۔ دوسرے مفسرین نے فرمایا کہ جس "ذلت" کا انھیں دنیاوی زندگی میں منہ دیکھنا پڑا وہ یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قبیلہ بنو نضیر کو مدینہ سے نکال دیا تھا اور دوسرے قبیلہ بنو قریظہ کے تمام جنگ کے قابل افراد کو قتل کروا دیا تھا اور ان کے عورتوں بچوں کو گرفتار کر لیا تھا، دنیاوی زندگی میں ان کی یہی ذلت تھی اور آخرت میں انھیں ان کے اعمال پر عذاب عظیم ہوگا۔ " وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ ". یعنی ان کی نافرمانی کے نتیجہ میں دنیاوی زندگی میں انھیں ذلت و رسوائی ملی ہے اور اس دنیا کے ختم ہونے کے بعد جب قیامت قائم ہوگی تو انھیں اس دنیا سے بھی زیادہ سخت عذاب میں ڈالا جائے گا۔

" وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ " (اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے) بعض علماء قرأت نے "عما تعملون" کے بجائے "عَمَّا يَعْمَلُونَ" (اور جو کچھ وہ کرتے ہیں) پڑھا ہے۔ صحیح دونوں قرأتیں ہیں، لیکن میرے نزدیک بہتر یہی دوسری قرأت ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے اس سے متصل آیت میں غائب ہی کا صیغہ یہودیوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اگرچہ شروع سے خطاب کا صیغہ استعمال ہوتا چلا آرہا ہے لیکن زیر تفسیر آیت سے متصل آیت میں غائب کا صیغہ ہے اور بہتر ہے کہ مفہوم کی آسانی کے لئے یہ بھی غائب ہی رہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ تمہارے ان بدترین اور قابل نفرت اعمال سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں ہے۔ اس کے یہاں تمہاری تمام بداعمالیاں محفوظ ہیں اور اس دنیا کی رسوائی اور ذلت کے بعد آخرت میں بھی تمہیں اس پر عذاب ہوگا۔

" أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ " (یہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیوی زندگی خرید لی ہے آخرت کے بدلہ میں، پس ان پر نہ عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا اور نہ انھیں مدد ہی پہنچے گی) انہیں لوگوں کے متعلق ارشاد ہے جو کتاب الٰہی کے بعض حصہ پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض حصے کا انکار کرتے ہیں، یعنی اپنے ہم قوم و ہم مذہب قیدیوں کا فدیہ دے کر انھیں تو آزاد کرا لیتے ہیں، لیکن آپس میں قتل و قتال سے باز نہیں آتے اور موقعہ ملتا ہے تو جلا وطن کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ اللہ تعالےٰ انہیں کے متعلق فرماتا ہے کہ انہوں نے اپنے جاہل، بے وقوف اور کم ظرف ہم مذہبوں پر اقتدار اور ان پر ریاست کو خریدا ہے اور آخرت کے بدلہ میں دنیا کی حقیر اور معمولی زندگی کو ترجیح دی ہے، خریدنے کے ساتھ اس کی تعبیر اس لئے کی کہ اللہ کا کفر کرکے وہ دنیاوی زندگی سے راضی اور خوش تھے اور آخرت کی زندگی اور اللہ پر ایمان کے مقابلہ میں اسے اختیار کئے ہوئے تھے اور خرید و فروخت میں بھی یہی ہوتا ہے کہ آدمی قیمت دیکر کوئی ایسی چیز لیتا ہے جو اس کے لئے وقتی طور پر زیادہ مناسب اور بہتر ہوتی ہے قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب انہوں نے اس طرح کی خرید و فروخت کی اور آخرت پر ایمان کے مقابلہ میں معمولی دنیاوی زندگی کو ترجیح دی تو یقیناً آخرت کے آرام و آسائش میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ بلکہ اس کے بدلہ میں انھیں عذاب ہوگا اور ان کے عذاب کو ہلکا نہیں کیا جائے گا، کیونکہ عذاب تو اسی شخص سے ہلکا کیا جا سکتا ہے جس کا جنت اور آخرت کی نعمتوں میں بھی کوئی حصہ ہو اور انہوں نے اپنے آپ کو بالکل تہی دامن رکھا ہے۔

Marfat.com

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ

اور ہم نے (اسے بنی اسرائیل) موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (توریت) دی اور (پھر) انکے بعد (درمیان میں یکے بعد دیگرے (برابر) مختلف پیغمبروں کو بھیجتے رہے اور (پھر) ہم نے عیسیٰ بن مریم کو

مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ اَفَكُلَّمَا جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا

(نبوت کے) واضح دلائل عطا فرمائے اور ہم نے ان کو روح القدس سے تائید دی تو کیا جب کبھی (بھی) کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسے احکام لائے جن کو تمہارا دل

تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ○

نہ چاہتا تھا، جب ہی تم نے تکبر کرنا شروع کر دیا سو بعضوں کو تو تم نے (نعوذ باللہ) جھوٹا بتلایا اور بعضوں کو (بیدھڑک) قتل ہی کر ڈالتے تھے۔

کتاب الٰہی، بینات اور روح القدس

"وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ" (اور ہم نے موسیٰ پر کتاب نازل کی اور ان کے پیچھے پے در پے ہم نے پیغمبر بھیجے) "اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتَابَ" یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام پر کتاب نازل کی، کتاب سے مراد توریت ہے۔ "وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ" یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد پے در پے سلسل پیغمبر بھیجے۔ "قَفَّيْنَا" کی اصل "قفا" (کھوپڑی) ہے، بولتے ہیں "قَفَوْتُ فُلَانًا" یعنی میں اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ "مِنْ بَعْدِهٖ" یعنی موسیٰ علیہ السلام کے بعد، اور "بِالرُّسُلِ" سے مراد انبیاء ہیں، رسول کی جمع ہے۔ واحد (ایک) کے لئے "رسول" اور جمع (دو سے زیادہ کے لئے) "رُسُلٌ" استعمال ہوتا ہے۔ اسی وزن پر "صبور اور صبر، شکور اور شکر" علی الترتیب واحد اور جمع کے لئے ہے۔ "قَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ" کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے پے در پے ایک ہی شریعت اور ایک ہی راستہ دکھانے کے لئے انبیاء بھیجے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے بھی انبیاء بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے ان میں سے کسی پر کوئی نئی شریعت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں نازل ہوئی، بلکہ سب اسی شریعت کو قائم کرنے کے لئے نازل ہوتے رہے جو موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے نازل کی تھی اور سب نے توریت ہی پر عمل کی طرف اپنے وقت کے اسرائیلیوں کو بلایا اس لئے فرمایا کہ "وقفینا من بعدہ بالرسل" یعنی موسیٰ علیہ السلام ہی کی شریعت اور انہیں کے طریقہ کی طرف بلانے کے لئے ہم نے پے در پے انبیاء ان کے پاس بھیجے۔

"وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ" (اور عیسیٰ بن مریم کو ہم نے روشن نشانات عطا کئے)، "بَيِّنَات" سے مراد وہ مافوق الفطرت چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے ان کی نبوت کی دلیل وحجت کے طور پر ظاہر کی تھیں، جیسے مردوں کو زندہ کرنا اور مادر زاد نابینا کو آنکھ والا بنا دینا اور اس کے علاوہ بہت سے معجزات جو آپ کے ذریعہ ظہور پذیر ہوئے تھے اور اس پر دلالت کرتے تھے کہ آپ کی نبوت کا دعویٰ حق اور صحیح ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی منقول ہے کہ مراد آپ کے وہ معجزات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کی تصدیق کے لئے آپ کے ہاتھ سے ظاہر کئے تھے، جیسے مردوں کو زندہ کر دینا، مٹی سے پرندہ کی شکل کا بنانا اور اس میں پھونک مارنا جس سے وہ مٹی اللہ کے حکم سے جاندار پرندہ بن جاتی تھی، مریضوں کو شفا بخشنا اور بہت سے ان کے پوشیدہ احوال کی اطلاع دے دینا کہ وہ کیا چیزیں اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے رکھتے ہیں وغیرہ۔ "وَاَيَّدْنَاهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ" (اور ہم نے روح القدس کے ذریعہ ان کی مدد کی) - "اَيَّدْنَاهُ" یعنی ہم نے ان کی مدد کی۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے یہی معنی منقول ہے۔ بولتے ہیں "اَيَّدَكَ اللّٰهُ" یعنی اللہ تمہیں قوت دے، تمہاری مدد کرے "رَجُلٌ ذُوْ اَيْدٍ" قوت والا آدمی۔ "رُوْحُ الْقُدُسِ" کے سلسلے میں کئی اقوال ہیں کہ اس سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین نے فرمایا کہ "روح القدس" سے مراد مشہور ومعروف فرشتہ جبریل علیہ السلام ہیں جنکے متعلق اللہ تعالیٰ نے اطلاع دی ہے کہ ان کے ذریعہ عیسیٰ علیہ السلام کی مدد وتائید کی جاتی تھی، یہ قول قتادہ، سدی، ضحاک اور ربیع رحمہم اللہ سے منقول ہے۔ شہر بن حوشب اشعری سے روایت ہے کہ چند یہودیوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ ہمیں "روح القدس" کے متعلق بتائیے

کہ وہ کون ہیں؟ آنحضور نے فرمایا: میں تمہیں اللہ کی اور اس کے نبی اسرائیل پر انعامات اور سزاؤں کی قسم دیتا ہوں، کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ جبریل ہیں اور وہ میرے پاس آتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہاں ہمیں معلوم ہے۔ دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد "انجیل" ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ" یعنی اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل کے ذریعہ مدد کی تھی، جو "روح" تھی۔ اسی طرح قرآن مجید کو بھی اللہ تعالیٰ نے "روح" بنایا، دونوں اللہ کی روح ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید کے متعلق ارشاد ہے کہ "وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا" (اور اسی طرح ہم نے آپ کے پاس روح (وحی) یعنی اپنا حکم بھیجا ہے) ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں نقل ہوا کہ "روح القدس" وہ "اسم" (اللہ تعالیٰ کا نام) ہے جس کے ذریعہ عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ یہ اس کی تفسیر میں نیسرا قول ہے۔ میرے نزدیک ان تمام اقوال میں صحیح قول یہ ہے کہ "روح القدس" سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا ہے کہ "وہ وقت یاد میں رکھو جب اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام سے کہے گا کہ میرا انعام اپنے اور اپنی والدہ کے اوپر یاد کرو، جبکہ میں نے تمہاری تائید روح القدس کے واسطہ سے کی تھی، تم آدمیوں سے کلام ان کی گود میں بھی کرتے تھے اور بڑی عمر میں بھی، اور جبکہ میں نے تمہیں کتاب و حکمت اور توریت اور انجیل کی تعلیم دی" "روح" جس سے اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی تائید کی تھی، اگر اس سے مراد انجیل ہوتی تو پھر آیت میں "جب میں نے آپ کی مدد کی روح القدس کے ذریعہ" اور اسی کے ساتھ" اور جب میں نے آپ کو کتاب، حکمت، توریت اور انجیل سکھائی"، دو ہم معنی آیتیں ہو جائیں گی کیونکہ روح القدس کا ترجمہ انجیل کرنے کے بعد آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ "جب میں نے آپ کی انجیل کے ذریعہ تائید کی اور جب میں نے آپ کو انجیل سکھائی"۔ ظاہر ہے کہ انجیل کے ذریعہ آپ کی تائید اسی وقت ممکن ہے جب پہلے آپ نے اسے سیکھ لیا ہوگا، پس آیت میں ایک ہی مضمون کو بغیر کسی ضرورت کے دہرانا ہو گیا، اللہ تعالیٰ کا ایک ایک حرف ہزاروں فائدے رکھتا ہے، وہ ذات اس سے بلند و برتر ہے کہ اس کا کوئی کلام فائدہ سے خالی ہو، اور یہاں "روح القدس" سے انجیل مراد لینے میں اسی قسم کا تکرار کلام لازم آتا ہے، جو غیر مفید ہے۔ اگرچہ یہ بھی حق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی کتابیں اپنے انبیاء پر نازل کیں وہ سب اس کی طرف سے "روح" تھیں، کیونکہ ان کے ذریعہ مردہ دلوں کو زندگی ملتی تھی اور گمراہ خیالات ان سے رہنمائی حاصل کرتے تھے، لیکن بہرحال آیت میں یہ مراد نہیں ہو سکتا۔

جبریل علیہ السلام کا نام اللہ تعالیٰ نے "روح" رکھا اور پھر اس کی اضافت "قُدُس" کی طرف کی، کیونکہ آپ کی تخلیق صرف اللہ کے حکم سے، والد و والدہ کے واسطہ کے بغیر ہوئی ہے۔ گویا آپ اس کی طرف سے "روح" ہیں، اور "قُدُس" کے معنی پاک کے آتے ہیں، اس لئے اس کی طرف روح کی اضافت کی۔ اسی مناسب سے عیسیٰ علیہ السلام کے لئے بھی "رُوْحٌ مِّنْهُ" آیا ہے (یعنی اللہ کی طرف سے روح) کیونکہ آپ بھی بغیر والد کے واسطہ کے اللہ کے حکم سے پیدا ہوئے تھے۔ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ "تَقْدِیس" کے معنی پاک کرنے کے ہیں اور اسی سے "قُدُس" پاکی کے معنی میں آتا ہے۔ ائمہ تفسیر کے اس سلسلے میں کئی اقوال ہیں کہ "قدس" کا معنی آیت میں کیا ہے، سدی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ "قدس" بمعنی برکت ہے۔ ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہیں۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی نقل ہوا ہے، آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد خود اپنے متعلق ہے "هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ" (اللہ وہی تو ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ بادشاہ ہے، پاک ہے،)

فرمایا کہ "قُدُّوس" اور "قُدُس" ایک ہی ہیں۔ کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی نقل ہے کہ "قُدُس" سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

تم ہمیشہ سے اپنی مرضی چلانے کے عادی ہو

"اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ" (تو کیا جب کبھی کوئی پیغمبر تمہارے پاس ان احکام کے ساتھ آیا جو تمہارے نفس کو نہ بھائے تو تم اکڑنے لگے، پھر بعض کو تم نے جھٹلایا اور بعض کو قتل ہی کرنے لگے) اس آیت سے

Marfat.com

بنی اسرائیل کے یہودی ہی مراد ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے اللہ تعالےٰ ان آیات میں ارشاد فرماتا ہے، اے گروہ یہود بنی اسرائیل! ہم نے تمہاری ہدایت کے لئے موسیٰ علیہ السلام کو توریت دی، ان کے بعد پے درپے انبیاء بھیجے اور عیسیٰ علیہ السلام کو جب ہم نے تمہارے پاس بھیجا تو انہیں روشن نشانات اور معجزات عطا کئے اور ان کی روح القدس سے تائید کی، لیکن تمہارا یہ حال ہے کہ جب بھی تمہارے پاس میرا کوئی نبی آیا اور اس راستہ کی طرف تمہیں ہدایت کرنی چاہی جس کے لئے تمہارا نفس تیار نہیں تھا تو تم نے تکبر کا مظاہرہ کیا، نافرمانی اور سرکشی کی، بعض انبیاء کو تو تم نے صرف جھٹلایا ہی تھا، لیکن بعض کو تو قتل بھی کیا۔ میرے انبیاء کے ساتھ تمہارا ہمیشہ سے یہی معاملہ ہے۔

وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ بَلۡ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفۡرِهِمۡ فَقَلِيۡلًا مَّا يُؤۡمِنُوۡنَ ○ وَلَمَّا

اور وہ یہودی افتخاری کہتے ہیں کہ ہمارے دل محفوظ ہیں، بلکہ اُن کے کفر کے سبب اُن پر خدا کی مار ہے سو بہت ہی تھوڑا سا ایمان رکھتے ہیں اور جب

جَآءَهُمۡ كِتٰبٌ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمۡ ۙ وَكَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ يَسۡتَفۡتِحُوۡنَ

اُن کو ایک ایسی کتاب پہنچی (یعنی قرآن) جو من جانب اللہ ہے (اور) اُس (کتاب) کی (بھی) تصدیق کرنے والی ہے جو پہلے سے اُن کے پاس ہے (یعنی توریت) حالانکہ اسکے قبل خود بیان کیا کرتے

عَلَى الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ۖ فَلَمَّا جَآءَهُمۡ مَّا عَرَفُوۡا كَفَرُوۡا بِهٖ ؗ فَلَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ○

تھے کفار سے مگر پھر جب وہ چیز آپہنچی جس کو وہ (خوب جانتے) پہچانتے ہیں، اُسکا (صاف) انکار کر بیٹھے سو (بس) خدا کی مار ہو ایسے منکروں پر۔

یہ دعویٰ!

"وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ" (اور یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل محفوظ ہیں)۔ "غُلۡفٌ" کی دو قراءتیں ہیں مشہور و معروف قرأت تو یہی "غُلۡفٌ" ہے، جسمیں لام ساکن پڑھا جاتا ہے اس قرأت کی بنیاد پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ "وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل پردوں میں (محفوظ) ہیں"، اس وقت یہ لفظ "اَغۡلَفُ" کی جمع ہوگا، اس چیز کو کہتے ہیں جو پردہ اور غلاف میں محفوظ ہو۔ اسی مناسبت سے غیر مختون مرد کو بھی "اَغۡلَف" کہتے ہیں اور غیر مختون عورت کے لئے "غَلۡفَاءُ" آتا ہے۔ تلوار (عربی میں اس کے لئے سیف آتا ہے) اگر نیام میں ہو تو اس کے لئے "سَيۡفٌ اَغۡلَفُ" بولتے ہیں۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا، دل چار طرح کے ہوتے ہیں، پھر آپ نے اس کی تفصیل ذکر کی، اور آخر میں فرمایا کہ ایک "قلب اغلف" (وہ دل جو پردہ میں ہو) ہوتا ہے۔ جو مغضوب علیہ ہے اور یہ کافر کا دل ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی تفسیر روایت ہے کہ "قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ" یعنی ہمارے دل پردے میں ہیں، ایک روایت میں آپ سے ہے کہ یہ وہ دل ہے جس پر مہر لگ چکی ہے۔ مجاہد، اعمش، قتادہ، ابوالعالیہ سُدّی اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہم سے یہی روایت ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دل پردہ میں (محفوظ) ہیں، اور آپ کی کوئی بات ہم پر اثر نہیں کرتی۔ دوسری قرارت ہے "غُلُفٌ" یعنی لام پر تشدید کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ جن علماء قرأت نے اس طرح پڑھا ہے ان کے نزدیک آیت کی تفسیر یہ ہے کہ "ہمارے دل علم کے ظرف ہیں، گنجینۂ علوم ہیں" اس صورت میں یہ "غِلَاف"

۵ عورتوں کا ختنہ ہمارے ملک میں ایک عجیب سی بات ہوگی، لیکن مردوں کی طرح عورتوں کا ختنہ بھی سنت ہے۔ ختنہ کی رسم عربوں میں زمانہ جاہلیت میں بھی تھی۔ یہ ان چند رسموں میں سے ایک ہے جو ابراہیم علیہ السلام کی سنتوں میں سے عربوں میں صحیح صورت میں باقی تھی۔ چنانچہ اسلام نے اس سنت ابراہیمی کو باقی رکھا۔ عرب میں اب بھی عورتوں کے ختنہ کے لئے عورتیں ہوتی ہیں۔ اور عورتوں میں بھی یہ رسم اب تک باقی ہے۔ لیکن ہمارے ہندوستان میں اس کا کوئی تصور ہی باقی نہیں رہا ہے۔ (مترجم)

Marfat.com

کی جمع ہوگی، اس وزن پر کتاب کی جمع "کُتُبٌ" حجاب کی جمع حُجُبٌ وغیرہ آتی ہے۔ آیت کا مطلب اس قرارت کی بنیاد پر یہ ہوا کہ "اور یہود کہتے ہیں کہ ہمارے دل علم کے خزانے اور اس کے ظرف ہیں" عطیہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے۔ ایک روایت میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے کہ آپ نے آیت کی تفسیر میں فرمایا "اور انہوں نے کہا کہ ہمارے دل علوم سے لبریز ہیں ہمیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی اور کی ضرورت نہیں ہے"۔ لیکن ان دونوں قرارتوں میں جائز صرف پہلی ہی قرارت ہے۔

یہ سب اللہ کی لعنت کے مظاہر ہیں

"بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ" یعنی بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے ان پر لعنت کر رکھی اور انھیں اپنی رحمت سے دور اور ذلیل کر رکھا ہے، کیونکہ وہ کفر کرتے ہیں، اللہ کے بھیجے ہوئے انبیاء کا انکار کرتے ہیں اور معجزات اور نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں۔ "لعن" کا حقیقی مفہوم دور کرنا، دھتکارنا ہے۔ اسی سے ملعون و لعین آتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے اس دعوے کی تردید و تکذیب کی ہے، جسمیں انہوں نے کہا تھا کہ "ہمارے دل تو پردے میں محفوظ و مامون ہیں" لفظ "بَلْ" ہمیشہ کلام میں اپنے سے پہلے جملے کی نفی اور اس کی تردید کے لئے آتا ہے۔ یہاں بھی ان کے دعوے کی تردید کی گئی ہے۔

"فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ" اس آیت کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں۔ بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "ان میں بجز معدودے چند کے کوئی ایمان نہیں لاتا" یہ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر ہے۔ ایک دوسری تفسیر یہ ہے کہ "وہ بہت تھوڑا ایمان رکھتے ہیں"۔ اللہ تعالیٰ یہ اطلاع دیتا ہے کہ ان آیات میں جن لوگوں کے اوصاف بیان ہوئے ہیں ان پر اس نے لعنت کی ہے اور اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو شریعت اس نے نازل کی ہے اس پر ان کا ایمان بہت تھوڑا ہے۔ "فَقَلِيْلًا" پر جو نصب ہے اس کی بھی وجہ صرف یہی ہے، کیونکہ یہ ایک محذوف مصدر کی صفت ہے، اصل میں یوں تھا، "فَاِيْمَانًا قَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ" (پس وہ بہت تھوڑا ایمان رکھتے ہیں) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت کی تفسیر میں قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے جو قول نقل ہوا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس تفسیر کے صحیح ہونے کیلئے ضروری تھا کہ "قَلِيْلًا" کو بجائے نصب کے رفع ہوتا اور عبارت یوں ہوتی "فَقَلِيْلٌ مَّا يُؤْمِنُوْنَ" اور "مَا" "مَنْ" کے معنی میں ہوتا، اسے نصب پڑھتے ہوئے "مَا" کو مَنْ کے معنی میں لینا جائز نہیں ہے۔

"فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ" میں لفظ "مَا" کے معنی کے سلسلے میں علماء لغت کے کئی اقوال نقل ہوئے ہیں۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ "زائدہ" ہے اور اس کا کوئی معنی مراد نہیں اور اصل عبارت یوں ہے۔ "فَقَلِيْلًا يُّؤْمِنُوْنَ" (ما کے ذکر کا فائدہ اس صرف قلت پر زور دینا ہے) دوسرے علماء نے کہا کہ "مَا" آیت میں عموم کے لئے آیا ہے۔ اس لفظ کے مفہوم میں ہر چیز آسکتی ہے ہمارے نزدیک یہی قول زیادہ صحیح ہے۔ "ایمان" کا معنی "تصدیق کرنا، ماننا" ہے۔ جن یہودیوں کا ذکر ہو رہا ہے وہ اللہ کی وحدانیت بعث اور ثواب و عقاب کو تو مانتے تھے، لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی نبوت کا کفر کرتے تھے، حالانکہ تمام ہی امور پر ایمان ان کے ضروری تھا، موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب الٰہی توریت میں ان سب چیزوں پر ایمان لانا ان پر فرض کیا گیا تھا۔ لیکن انہوں ان میں سے صرف چند چیزوں کو مانا، اور یہی ان کا قلیل اور تھوڑا سا ایمان تھا جسکو آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں جن امو کو انہوں نے جھٹلایا (یعنی آنحضور کی نبوت، آپ کی شریعت اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب) تو وہ بہت زیادہ تھی۔ بعض مفسرین نے آیت کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ "وہ کسی بھی چیز پر ایمان نہیں رکھتے" آیت میں اگرچہ یہی الفاظ ہیں کہ "وہ کم ہی چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں" لیکن عربی محاورے میں "قلت" عدم کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ بولتے ہیں "قَلَّمَا رَأَيْتُ مِثْلَ هٰذَا قَطُّ" (کم ہی کبھی میں نے ایسا دیکھا ہوگا" یہاں بھی مطلب یہی ہے کہ میں نے بالکل ایسا نہیں دیکھا) اس طرح کے محاورات کلام عرب میں بکثرت ہیں جس میں قلت یا اس ہم معنی الفاظ استعمال ہوتے ہیں، لیکن مراد بالکلیہ نفی ہوتی ہے۔

دیدہ دلیری

"وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ" یعنی جب ان یہودیوں کے پاس ایک کتاب اللہ کی

Marfat.com

پہنچ گئی اور وہ کتاب ایسی ہے کہ ان کے پاس پہلے سے جو کتاب موجود ہے اس کی تصدیق کرتی ہے۔ "کتاب" سے آیت میں مراد قرآن مجید ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور یہ قرآن مجید ان تمام آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں قتادہ اور ربیع رحمۃ اللہ علیہما سے یہی روایت ہے کہ آیت میں "کتاب" سے مراد قرآن مجید ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی اور یہ اس سے پہلے کی آسمانی کتابوں، توریت وانجیل کی تصدیق کرتی ہے۔

"وَکَانُوْا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَی الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَھُمْ مَّا عَرَفُوْا کَفَرُوْا بِہٖ" یعنی یہ یہودی جن کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس شان کی کتاب پہنچ چکی ہے، یہ خود بھی اس سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ فتح ومدد مانگا کرتے تھے، لیکن جب ان کے پاس وہ آ گیا جس کو یہ لوگ خوب پہچانتے ہیں تو اس سے کفر کر بیٹھے" "اِسْتِفْتَاح" (جس سے آیت میں یَسْتَفْتِحُوْنَ کا صیغہ استعمال ہوا ہے) کے معنی مدد چاہنے کے ہیں۔ یعنی یہ یہودی مشرکین عرب کے مقابلہ میں آنحضور کی بعثت سے پہلے اللہ سے آپ کے ذریعہ مدد چاہا کرتے تھے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ انصار کے شیوخ کے حوالہ سے بیان کرتے تھے کہ یہ آیت ہمارے اور مدینہ کے قرب وجوار میں آباد یہودیوں ہی کے بارے میں نازل ہوئی تھی، وہ بیان کرتے تھے کہ زمانہ جاہلیت میں ہم ایک زمانہ تک (لڑائیوں میں) ان پر غالب رہے، ہم اہل شرک تھے اور وہ اہل کتاب تھے، وہ اس وقت کہتے تھے کہ ایک نبی جلد ہی مبعوث ہونے والے ہیں اور ان کی بعثت کا زمانہ قریب آ پہنچا ہے۔ تمہیں وہ اس طرح برباد کر دیں گے جیسے (پہلی امتوں میں) عاد وارم کی قومیں برباد کی گئی تھیں۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو قریش کے قبیلہ میں مبعوث کیا تو انہوں نے آپ کا کفر کیا (کہ آپ بنی اسرائیل ہی میں کیوں نہیں مبعوث ہوئے) اسی واقعہ کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ کیا ہے کہ" پھر جب ان کے پاس وہ آ گیا جس کو وہ خوب پہچانتے تھے تو اس کا کفر کر بیٹھے"۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہودی، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے آپ کے ذریعہ اوس وخزرج کے ساتھ لڑائیوں میں اللہ سے مدد چاہتے تھے، لیکن جب آپ عربوں میں مبعوث ہوئے تو آپ کا انکار کر بیٹھے اور جو باتیں آپ کے متعلق پہلے کہتے تھے اسے خود ہی جھٹلانے لگے۔ ایک مرتبہ ان سے معاذ بن جبل اور بشر بن براء رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہودیو! اللہ سے ڈرو، تم تو خود ہی پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ سے مدد مانگتے تھے، ہم اس وقت اہل شرک میں سے تھے اور تم ہمیں بتلاتے تھے کہ آنحضور مبعوث ہوں گے، تم آنحضور کے اوصاف بھی بیان کیا کرتے تھے۔ اس پر سلام بن مشکم جس کا تعلق یہودیوں کے قبیلہ بنو نضیر سے تھا بولا کہ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں آئی ہے جسے ہم پہچانتے ہوں، جس کا ہم تم سے ذکر کیا کرتے تھے، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ نہیں ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیت نازل کی۔

علی ازدی، قتادہ اور ابو العالیہ رحمہم اللہ سے بھی یہی روایت ہے کہ کفار عرب کے مقابلہ میں یہودی دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ! ہمارے پاس اس نبی کو بھیجئے جن کا تذکرہ توریت میں موجود ہے، تاکہ وہ ان عربوں کو قتل کرے اور انہیں عذاب دے[۱]۔ لیکن جب آنحضور

[۱] اس سے بھی یہودیوں کے مزاج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر ان کے یہاں نبی آخر الزماں کے انتظار کی کوئی وجہ تھی تو یہ کہ وہ مبعوث ہونے کے بعد انکے مخالفین کے قتل وغارتگری کا فرض انجام دے گا، کہاں حضور اکرم کی شان رحمت اور کہاں ان کا آپ کے متعلق یہ تخیل! یہودیوں کے اسی تخریب پسندانہ مزاج اور کفر وعدوان کا نتیجہ ہے کہ انبیاء کی نسل سے ہونے کے باوجود صدیوں سے رسوا اور ذلیل چلی آ رہی ہے۔ تاریخ میں اس قوم کو ایک ہی فرعون، ایک ہی بخت نصر اور ایک ہی میدان تیہ سے سابقہ نہیں پڑا ہے، سرکشی، فساد، کفر اور ناشکری نے ان کے لئے سیکڑوں فرعون پیدا کئے ہیں۔ قدرت نے کتنے ہی بخت نصر انپر عذاب اور ان کی نسلوں کو تباہ وبرباد کر دینے کے لئے انپر مسلط کئے ہیں اور کتنے ہی میدان تیہ کی کٹھنائیوں سے نہیں گذرنا پڑا ہے۔ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس سے بڑھ کر سخت جان قوم شاید ہی دنیا میں کبھی پیدا ہوئی ہے۔ غالباً اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں عذاب میں مبتلا کرتے رہنے کیلئے ہی انہیں اتنا سخت جان بنایا ہے یہ لوگ دنیا میں ان لوگوں کا نمونہ ہیں جنپر آخرت میں عذاب شدید ہوگا اور جنکے باوجود کبھی فنا نہیں ہونگی۔ زمخشری ج۱

Marfat.com

کی بعثت عربوں میں ہوئی تو محض حسد کی وجہ سے کہ نبی آخر الزماں بنی اسرائیل میں کیوں نہ پیدا ہوا، انہوں نے کفر و انکار شروع کر دیا۔ سدی عطاء، مجاہد، سعید بن جبیر اور ابن زید رحمہم اللہ سے بھی اسی طرح کی روایتیں ہیں کہ مراد مدینہ کے یہودی ہیں۔

آیت زیر تفسیر میں ذکر ہوا ہے کہ "جب ان کے پاس ایک کتاب اللہ کے پاس سے پہنچ گئی جو تصدیق کرنے والی ہے اس کی جو ان کے پاس پہلے سے موجود ہے" لیکن اس کے بعد یہودیوں کا اس پر ردعمل کیا ہوا؟ اس کے بیان میں آیت بالکل خاموش ہے اور آگے اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔ ادب عربی کے علماء کہتے ہیں کہ اس کا ذکر اس لئے نہیں ہوا کہ جو واقعات بیان ہو رہے ہیں ان سے مخاطب خود سمجھ لیگا کہ جب وہ کتاب الٰہی ان کے پاس پہنچی تو ان کا ردعمل کیا ہوا۔ کوئی کلام جب طویل ہو جاتا تو عربوں کی یہ عادت تھی کہ اکثر جواب کو اور ان چیزوں کو حذف کر دیتے تھے جن کے متعلق اعتماد ہوتا کہ مخاطب یعنی سننے والا خود سمجھ جائے گا۔ اس طرز کلام کی مثالیں خود قرآن مجید میں بھی بکثرت ہیں۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ آیت کے آخر کا یہ جملہ کہ "پھر جب ان کے پاس وہ آگیا جس کو وہ خوب پہچانتے تھے تو اس سے کفر کر بیٹھے" مذکورہ بالا آیت کا جواب ہے یعنی ان یہودیوں کا ردعمل یہ ہوا کہ جب نبی آگئے اور اللہ کی کتاب ان کے پاس پہنچ گئی تو انہوں نے اس سے کفر کر دیا۔ "فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ" (سو اللہ کی لعنت ہو کافروں پر) "لعنت" اور "کفر" کے مفہوم پر اس سے پہلے کی آیتوں میں ہم پوری بحث کر چکے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو اللہ نے رسوا کیا اور اپنی رحمت سے دور کیا جو حق کا جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ

وہ حالت (بہت ہی) بری ہے جسکو اختیار کر کے وہ اپنی جانوں کو بیچ ڈالتے ہیں اور وہ حالت یہ ہے کہ کفر کرتے ہیں ایسی چیز کا جو حق تعالیٰ نے نازل فرمائی محض (اسی) ضد پر کہ اللہ تعالیٰ اپنے

عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝

فضل سے جس بندہ پر چاہیں منظور ہو نازل فرما دیتے یہ لوگ غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے اور ان کفر کرنے والوں کو ایسی سزا ہو گی جسمیں (علاوہ تکلیف کے) ذلت بھی ہے۔

انکار کی وجہ صرف حسد ہے

"بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا" (بری ہے وہ چیز جس کے عوض انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا ہے، کہ انکار کرتے ہیں اس کلام کا جو اللہ نے نازل کیا ہے محض ضد کی وجہ سے) "اِشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ" کا معنی ہے "جس کے عوض انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا ہے"، سدی رحمۃ اللہ علیہ سے یہی معنی منقول ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی فرمایا کہ انہوں نے حق کو باطل کے عوض میں بیچ ڈالا تھا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف کو عربوں سے چھپانے کی کوشش کی تھی اور یہ بہت بری تجارت تھی۔ عرب بولتے ہیں "شَرَيْتُ" یعنی میں نے بیچ دیا، "اِشْتَرَوْا" اسی سے مصدر افتعال کا ایک صیغہ ہے۔ عام طور سے کلام عرب میں "شَرَيْتُ" بیچنے کے معنی میں اور "اِشْتَرَيْتُ" خریدنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن کبھی کبھی اس کے برعکس بھی استعمال کر لیتے ہیں اور آیت میں بھی "اشتروا" بیچنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے "بَغْيًا" کے معنی ہیں حسد، ضد۔ قتادہ، سدی، ابو العالیہ اور ربیع رحمہم اللہ سے یہی معنی مروی ہیں، فرمایا کہ انہوں نے محض اس حسد میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کفر و انکار کیا کہ آپ کا تعلق عربوں سے کیوں ہے، آپ بنی اسرائیل میں کیوں نہیں پیدا ہوئے۔ آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب توریت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے متعلق وحی نازل کی تھی اور اس کی تصدیق کا بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا۔ لیکن انہوں نے، صرف اس ضد میں کہ اللہ نے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہا اپنا فضل نازل کیا، توریت کے اس حکم کا انکار کر کے اپنی جانوں کو بہت بری چیز کے بدلہ میں بیچ ڈالا ہے۔ بیع و شراء (خرید و فروخت) کا مطلب عرب یہ لیتے ہیں کہ کسی چیز کا اصل مالک اس سے اپنے حقوق ملکیت کو ختم کر کے اس کے بدلہ میں کوئی دوسری چیز لے لے۔ پھر محاورہ کے طور پر ہر بھلی بری چیز کے لئے اس کا استعمال ہونے لگا، کوئی شخص اگر کوئی اچھا یا برا کام کرتا اور اس کا بدلہ کسی صورت میں اسے ملتا تو اس کے لئے بھی بیع و شراء (خرید و فروخت) کمانے اور حاصل کرنے

Marfat.com

کے معنی میں بولا جانے لگا۔ آیت میں بھی محاورہ ہی کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

بنی اسرائیل اصل میں نبوت و حکمت کو اپنی میراث سمجھتے تھے اور قومی تفوق اور برتری کا یہی غیر فطری تصور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے کفر و انکار کا باعث بنا تھا۔ حسد اور ضد کی وجہ سے ان کے کفر و انکار کی مزید تفصیل سورۂ نساء میں موجود ہے، ارشاد ہے "کیا تو نے ان لوگوں پر نظر نہیں کی جنھیں کتاب سے بہرہ ور کیا گیا تھا، اس پر بھی یہ بت اور شیطان کو مانتے ہوئے ہیں اور کفر کرنے والوں کی بابت کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی لوگ زیادہ ھدایت یاب ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ لعنت کرے تو تو اس کا کوئی مددگار ہرگز نہ پائے گا، انہیں بھی کچھ اقتدار نصیب ہو جائے تو یہ تو لوگوں کو تل بھر بھی نہ دیں، کیا یہ لوگوں پر حسد کر رہے ہیں، ان چیزوں کے باعث جو انہیں اللہ نے اپنے فضل سے دے رکھی ہیں، سو ہم نے تو آل ابراہیم کو کتاب و حکمت دی ہے اور ہم نے انہیں بڑا اقتدار بھی دیا ہے"۔

"اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ" (کہ اللہ نے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہا اپنا فضل خاص نازل کیا) کا تعلق زیر تفسیر آیت ہی سے ہے اور اس کی تفسیر ہم بیان کر چکے ہیں۔ قتادہ انصاری رحمۃ اللہ علیہ اپنے قبیلہ کے شیوخ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ "بَغْیًا اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ" کا مطلب یہ ہے کہ محض اس حسد میں کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت ان کے سوا دوسروں کو کیوں دی (انہوں نے کفر و انکار کیا) ابو العالیہ، ربیع، سدی اور علی ازدی سے بھی اسی طرح تفسیر منقول ہے۔

غضب بالائے غضب

"فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ" (سو وہ مستحق ہو گئے غضب بالائے غضب کے) بنی اسرائیل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے کفار کے مقابلہ میں مدد چاہا کرتے تھے لیکن جب آنحضور مبعوث ہو گئے تو محض نسلی اور قومی عصبیت، احساس تفوق اور آنحضور اور عربوں سے حسد کی وجہ سے انہوں نے آپ کا انکار شروع کر دیا پہلے سے انپر غضب تو تھا ہی، کیونکہ اس سے پہلے وہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کفر کر چکے تھے، گوسالہ کو پوج چکے تھے یا اس کے علاوہ اور بہت سے گناہ جو انہوں نے کئے تھے اور انکی وجہ سے اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے تھے، لیکن اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کفر و انکار کی وجہ سے غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے ہیں، ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک غضب تو انپر اس وجہ سے ہوا تھا کہ انہوں نے توریت کو ضائع کر دیا تھا، پھر دوسرا غضب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کفر و انکار کی وجہ سے ہوا قتادہ، ابو العالیہ اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا کہ اللہ کا پہلا غضب انپر عیسیٰ علیہ السلام سے کفر کی وجہ سے ہوا تھا اور دوسرے غضب کے مستحق وہ حضور اکرم کی نبوت سے انکار کی وجہ سے ہوئے۔ شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کے چار مرتبے ہوں گے، ایک تو وہ شخص ہو گا جو عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان رکھتا تھا، پھر جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپ پر بھی ایمان لایا، اس شخص کو (اس کے ایمان پر) دہرا اجر ملے گا۔ دوسرا وہ شخص ہو گا جو عیسیٰ علیہ السلام کا پہلے سے کافر تھا، لیکن حضور اکرم کی بعثت کے بعد آپ پر ایمان لایا تو اسے (اس کے ایمان پر) ایک اجر ملے گا۔ تیسرا شخص وہ ہو گا جو پہلے سے عیسیٰ علیہ السلام کا بھی کافر تھا، اور جب آنحضور مبعوث ہوئے تو آپ کا بھی کفر کیا، وہ غضب بالائے غضب کا مستحق ہو گا۔ چوتھا وہ شخص ہو گا جو عیسیٰ علیہ السلام کا کافر تھا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے مر گیا تو وہ ایک غضب کا مستحق ہو گا۔ مجاہد اور عبید بن عمیر رحمۃ اللہ علیہما سے روایت ہے کہ ان پر اللہ کا پہلا غضب اس لئے ہوا تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے توریت میں تحریف اور تبدیلی کیا کرتے تھے اور دوسرے غضب کے مستحق وہ آنحضور کی نبوت کے انکار کی وجہ سے ہوئے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ان پر پہلا غضب گوسالہ پرستی کی وجہ سے ہوا تھا اور دوسرا غضب آنحضور کے انکار کی وجہ سے۔

"وَلِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّہِیْنٌ" یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے انکار کرنے والے تمام انسانوں پر ذلت کا عذاب ہو گا، یہ عذاب یا صرف آخرت میں ہو گا یا آخرت اور دنیا دونوں میں ہو گا۔ "مُّہِیْنٌ" ایسے عذاب کو کہتے ہیں کہ جس پر یہ عذاب ہو اسے انتہائی ذلیل و رسوا کر کے رکھ دے، ایک ایسا عذاب جس کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو اور جس ذلت میں اسے ڈال دیا گیا ہے اس سے نکل کر عزت پانے کی کوئی صورت

Marfat.com

ہوگا یہ عذاب صرف کافروں کو ہوگا۔ دوسرا عذاب وہ ہے جو صرف تنبیہ و سرزنش کے لئے ہوتا ہے، اس عذاب کو "مُّھِین" نہیں کہینگے جیسے کسی نے چوری کی اور اسلامی قانون کے مطابق اس کا ہاتھ کاٹ لیا گیا، کسی نے زنا کی اور اس پر حد قائم کر دی گئی اور اس کے علاوہ دوسرے بہت سے "عذاب" (سزائیں) جو گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں۔ یہی حال گناہ کبیرہ کے مرتکب ان مسلمانوں کا ہوگا جنھیں انکی جرم و گناہ کے مطابق آخرت میں سزا دیجائے گی، تاکہ ان کے گناہ جھڑ جائیں اور پھر انھیں جنت میں داخل کیا جائے گا۔ یہ سب بھی عذاب ہیں، لیکن "مُّھِین" نہیں ہیں، انھیں "عذاب غیر مہین" کہا جائے گا۔ اور اس عذاب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کے گناہوں کی انھیں سزا دیکر عزت و کرامت اور جنت کیلئے انھیں تیار کر لیا جائے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ تم ایمان لاؤ ان (تمام) کتابوں پر جو اللہ تعالیٰ نے (متعدد پیغمبروں پر) نازل فرمائی ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو (صرف) اُس (ہی) کتاب پر ایمان لاوینگے جو ہم پر نازل کی گئی ہے (یعنی تورات)

وَرَاءَهُ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَهُمْ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنْبِيَاءَ اللَّهِ مِنْ قَبْلُ

اور جتنی اُسکے علاوہ ہیں اُن سب کا انکار کرتے ہیں حالانکہ وہ بھی حق ہیں اور تصدیق کرنیوالی بھی ہیں اُن کے جو اُن کے پاس ہے (یعنی تورات کی) آپ یہ بھی کہیئے تو اچھا پھر کیوں قتل کیا کرتے تھے اللہ کے پیغمبروں کو پہلے

إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ○ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ

زمانہ میں اگر تم (تورات پر) ایمان رکھنے والے تھے اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) تم لوگوں کے پاس صاف صاف دلیلیں لائے۔ (مگر) اس پر بھی تم لوگوں نے گوسالہ کو (معبود) تجویز کر لیا موسیٰ علیہ السلام کے

بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ○ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ ط

(طور پر جانے کے) بعد اور تم (اس تجویز میں) ستم ڈھا رہے تھے اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے تمہارا قول و قرار لیا تھا۔ اور طور کو تمہارے (سروں کے) اوپر لا کھڑا کیا تھا (اور حکم دیا کہ) لو جو کچھ

خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ

(احکام) ہم تم کو دیتے ہیں ہمت (اور پختگی) کیساتھ اور سنو اُس وقت اُنہوں نے زبان سے (تو) کہدیا کہ ہم نے سن لیا اور (اور ہم سے عمل نہ ہوا) اور بوجہ اس کی یہ ہے کہ اُنکے قلوب میں وہی گوسالہ پیوست

بِكُفْرِهِمْ قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهِ إِيمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ○

ہوگیا تھا اُنکے کفر (سابق) کی وجہ سے آپ فرما دیجئے کہ یہ افعال بہت بُرے ہیں جنکی تعلیم تمہارا ایمان تمکو کر رہا ہے اگر تم (اب بھی) اہل ایمان ہو۔

یہ بھی کوئی جواب ہے

"وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا" یعنی جب بنی اسرائیل کے ان یہودیوں سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مدینہ میں رہتے تھے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اور تصدیق کرو اس قرآن کی جو اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل ہوا، یعنی توریت پر جو موسیٰ علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے نازل کیا تھا۔ "وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ" یعنی جو کچھ توریت کے علاوہ ہے اس کا یہ کفر کرتے ہیں۔ "وَرَاءَ" آیت میں "سِوَىٰ" (علاوہ سوا) کے معنی میں ہے۔ یعنی تورات کے سوا، اس کے بعد جو کتابیں اللہ نے نازل کیں۔ ان کا یہ انکار کرتے ہیں۔ قتادہ، ابو العالیہ اور ربیع رحمہم اللہ سے یہی روایت ہے "وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَهُمْ"۔ یعنی جو کتاب ان پر نازل کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ وہ کتابیں جو دوسرے انبیاء پر نازل کی گئی ہیں، وہ بھی حق ہیں۔ مراد خاص طور سے قرآن مجید ہے جو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا تھا چنانچہ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ مراد قرآن مجید ہے، یعنی قرآن مجید خود بھی حق ہے اور اس کی بھی تصدیق کرنے والا ہے جو ان کے پاس ہے۔ قرآن مجید کی

Marfat.com

صفت "مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ" (اس کی بھی تصدیق کرنے والا ہے جو اُن کے پاس ہے) اس لئے لائے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی تمام کتابیں ایک دوسرے کی تصدیق و تائید کرتی ہیں. قرآن مجید کی طرح انجیل میں بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا حکم ہے، اسی طرح موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب تورات میں بھی قرآن مجید کی تصدیق اور آنحضور پر ایمان لانے اور آپ کی اتباع کرنے کی تاکید ہے. اس لئے اللہ تعالےٰ نے یہودیوں کو مخاطب کرکے فرمایا کہ توریت کے علاوہ اللہ تعالےٰ کی دوسری کتابیں جو اس نے اپنے انبیاء پر نازل کی ہیں وہ بھی حق ہیں اور اس کتاب (توریت) کی تصدیق کرتی ہیں جو ان کے پاس موجود ہے. "قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْبِيَاءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" یعنی اے محمد! ان یہودیوں سے جنہیں آپ جب یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے کلام پر ایمان لاؤ تو یہ آپ کو جواب دیتے ہیں کہ جو ہمارے اوپر نازل ہوا ہے ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں، آپ انہیں کہئے کہ اگر یہی بات ہے تو پھر تم اس سے پہلے انبیاء کو قتل کیوں کرتے رہے ہو. اللہ نے جو کتاب تم پر نازل کی تھی (یعنی توریت) اسمیں تو ان کا قتل تم پر حرام کیا گیا تھا. بلکہ تمہیں ان کی اتباع اور پیروی کا حکم دیا گیا تھا. اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے ان کے اس دعوے کو جھٹلایا ہے کہ "ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں جو ہمارے اوپر نازل ہوا ہے" آیت میں انھیں اسپر شرم دلائی گئی ہے. سدی رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے. "تَقْتُلُوْنَ" اگرچہ مضارع (موجودہ اور آنے والے زمانہ پر دلالت کرنے والا) کا صیغہ ہے لیکن معنی میں ماضی (گذرے ہوئے زمانہ کی خبر دینے کے لئے) ہے. کلام عرب میں اس طرح عام استعمال ہے.

آیت میں خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودیوں سے ہے، اگرچہ اعمال ان کے "بزرگوں" کے ذکر ہو رہے ہیں، یہ عربوں کے اسی عام دستور کے مطابق ہے جس کا ذکر کئی مرتبہ ہو چکا ہے. "اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" یعنی جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے، اگر واقعی تم اللہ کی اس کتاب پر ایمان والے تھے جو تم پر نازل ہوئی تھی تو پھر تمہارے اسلاف نے انبیاء کو قتل کیسے کیا؟ اور تم ان کے ان افعال سے راضی اور خوش کیوں ہو؟

کھلے ہوئے معجزات کا انکار

"وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ" (اور موسیٰ تمہارے پاس کھلے ہوئے نشان لیکر آئے اسپر بھی تم نے ان کے پیچھے گوسالہ کو اختیار کر لیا اور تم تو ہو ہی ظالم) یعنی تمہارے پاس موسیٰ علیہ السلام ایسے کھلے ہوئے معجزات و نشانات لیکر آئے جو اُن کی نبوت کے من جانب اللہ ہونے اور ان کی سچائی پر دلالت کرتے تھے. آپ کے معجزات میں ایک عصا کا معجزہ تھا جو صاف اژدھا بن گیا. آپ کا ہاتھ تھا کہ جب آپ نے اسے نکالا تو دیکھنے والوں کے روبرو بیک خوب روشن تھا. آپ کے عصا مارنے سے سمندر میں راستہ بن گیا اور تمام بنی اسرائیل اس راستہ سے سمندر پار کر گئے، ان کی نافرمانی پر جَرَاد (ٹڈی دل) ضَفَادِع (مینڈک) اور قُمَّل (جوں) کا ان پر عذاب بھی آپ کے معجزات تھے. موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو "بَيِّنَات" کہا گیا، کیونکہ دیکھنے والوں کے سامنے ان کا معجزہ ہونا بالکل صاف اور واضح بات تھی اور ان سے ہر شخص سمجھ سکتا تھا کہ کوئی انسان اللہ کی تائید و مدد کے بغیر ایسی چیزیں نہیں دکھا سکتا. یہ "بَيِّنَة" (کھلا ہوا واضح) کی جمع ہے. "ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ" یعنی پھر جب موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کے وعدہ کے مطابق طور پر گئے تو تم نے گوسالہ کو اختیار کر لیا تھا. لیکن اگر "بَعْدِهٖ" میں ھا کی ضمیر موسیٰ علیہ السلام کی طرف نہ لوٹائی جائے، بلکہ اس سے "بینات" مراد لیا جائے اور "ذکر مجئی" جو جاءکم میں ہے اس کی طرف ضمیر لوٹائی جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ بینات اور کھلی ہوئی نشانیوں کے بعد پھر تم نے گوسالہ کو (معبود کی حیثیت سے) اختیار کر لیا. بولتے ہیں "جِئْتَنِيْ فَكَرِهْتُهٗ" یعنی تم میرے پاس آئے تو تمہارا آنا مجھے برا معلوم ہوا. یہاں بھی "ھا" کی ضمیر "مجئی" کی طرف لوٹ رہی ہے. "وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ" یعنی تمہیں یہ گوسالہ پرستی اور غیر اللہ کی عبادت کرنی نہ چاہئے تھی، تم نے اس طرح وہ عمل کیا جسکا تمہیں حق نہیں تھا، کیونکہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں. آیت میں اللہ تعالےٰ نے یہودیوں کو تنبیہ کی ہے اور انہیں شرم دلائی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے کھلے ہوئے اور واضح معجزات دیکھنے کے باوجود جب تم ان کی نافرمانی سے باز نہ آئے تو پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے اور اپنی کتاب پر ایمان کے دعوے کے باوجود اس میں حضور اکرم کے

Marfat.com

اوصاف سے انکار تمہارے لئے زیادہ آسان ہے۔

"وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَا اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّۃٍ وَّاسْمَعُوْا قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا" یعنی اور وہ وقت بھی یاد کرو جب ہم نے تم سے قول و قرار لیا تھا کہ تورات جو ہم نے تم پر نازل کی ہے اسے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو، اسمیں مذکور ہمارے احکام پر عمل کرو اور جن چیزوں سے ہم نے تمہیں روکا ہے ان سے بچو اور احکام و نواہی پر عمل طبیعت کے نشاط اور لگن کے ساتھ کرو، تو تم نے اس کے مطابق عمل کرنے کا وعدہ اس وقت کیا جب ہم نے تمہارے اوپر طور پہاڑ کو بلند کیا۔ "وَاسْمَعُوْا" یعنی میرے حکم کو توجہ کے ساتھ سنو، اور طاعت کے ساتھ اسے قبول کرو۔ بولتے ہیں "سَمِعْتُ وَاَطَعْتُ" یعنی میں نے سنا اور تمہارے حکم کی اطاعت کی، اسی طرح آیت میں بھی "وَاسْمَعُوْا" کا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ تم نے سنا ہے اسے قبول کرو اور اس پر عمل کرو۔ اس کے بعد ارشاد ہے۔ "قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا" یعنی جب اللہ تعالےٰ نے ان سے قول و قرار لیا کہ تورات پر عمل کریں اور جو کچھ انہوں نے سنا ہے، اسے اطاعت کے ساتھ قبول کریں تو وہ بولے کہ ہم نے سن تو لیا، لیکن ہم نے مانا نہیں۔ "وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ" (اور ان کے دلوں میں گوسالہ ان کے کفر سابق کے سبب سے پیوست ہو گیا تھا) مفسرین کے اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں کئی اقوال ہیں۔ قتادہ، ابو العالیہ اور ربیع رحمہم اللہ سے روایت ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے کفر کے سبب سے گوسالہ کی محبت انکے دلوں میں گھر کر گئی تھی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ انہوں نے اس دریا کا پانی پیا جس پر گوسالہ (جو مختلف دھاتوں سے تیار کیا گیا تھا) کا برادہ چھڑک دیا گیا تھا اور اسی کے متعلق آیت میں ذکر ہوا ہے۔ لیکن مناسب تفسیر پہلی ہی ہے، کیونکہ پانی کے متعلق یوں کبھی نہیں بولتے کہ "اُشْرِبَ فُلَانٌ فِیْ قَلْبِهٖ" (فلاں نے اپنے دل میں پانی پیا) البتہ کسی چیز کی محبت کیلئے یہ ضرور استعمال ہوتا ہے "اُشْرِبَ قَلْبُ فُلَانٍ حُبَّ کَذَا" (فلاں چیز کی محبت فلاں شخص کے دل میں گھر کر گئی ہے) لفظ "حُب" (محبت) کا ذکر آیت میں اس لئے نہیں کیا کہ ہر شخص جانتا ہے کہ خود گوسالہ کسی کے دل میں پیوست نہیں ہو سکتا، اس کی محبت ہی پیوست ہو سکتی ہے۔ محاورات زبان میں یہ ایک عام چیز ہے۔

"قُلْ بِئْسَمَا یَاْمُرُکُمْ بِهٖۤ اِیْمَانُکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ" یعنی اے محمد! ان یہودیوں سے کہدیجئے کہ اگر تمہارا ایمان تمہیں اللہ کے نبیوں اور اس کے رسول کے قتل، اللہ کی کتابوں کو جھٹلانے اور اس کی شریعت کے انکار کرنے کا حکم دیتا ہے تو پھر تمہارا ایمان تمہیں بہت ہی بری چیز کا حکم دیتا ہے۔ "اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ" یعنی اگر تم واقعی اس کی تصدیق کرنے والے ہو اور اس پر ایمان لانے والے ہو جو اللہ نے تم پر نازل کی ہے (آیت میں اللہ نے یہودیوں کو جھٹلایا ہے، کیونکہ تورات تو ان تمام چیزوں سے انہیں روکتی ہے اور اس کے برعکس عمل کا حکم دیتی ہے، ارشاد ہے کہ اگر توریت پر تمہارا ایمان تمہیں یہی حکم دیتا ہے پھر تو یہ حکم بہت ہی برا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے آیت میں بتایا ہے کہ تورات میں اس طرح کا کوئی حکم نہیں، یہ تو تورات اور اللہ کے حکم کی سراسر مخالفت ہے۔

قُلْ اِنْ کَانَتْ لَکُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَۃُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَۃً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا

آپ کہدیجئے کہ اگر (بقول تمہارے) عالم آخرت محض تمہارے ہی لئے نافع ہے بلا شرکت غیرے تو تم (اس کی تصدیق کے لئے ذرا) موت کی تمنا کر کے دکھلا دو

الْمَوْتَ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○ وَلَنْ یَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ

اگر تم (اس دعوی میں) سچے ہو۔ اور وہ ہرگز کبھی اس (موت) کی تمنا نہ کریں گے بوجہ (خوف سزا) ان اعمال (کذبیہ) کے جو اپنے ہاتھوں سمیٹے ہیں اور اللہ تعالےٰ کو خوب

عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ○ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَیٰوۃٍ ۚۛ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا ۚۛ

اطلاع ہے ان ظالموں کی حالی کی اور آپ (تو) ان کو حیات (دنیویہ) کا حریص اور (عام) آدمیوں کو (بھی) بڑھکر پاویں گے۔ اور مشرکین سے بھی ان میں کا

Marfat.com

يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهِ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ
(ایک ایک شخص) اس ہوس میں ہے کہ اُس کی عمر ہزار برس کی ہو جائیگی اور یہ عذاب سے تو نہیں بچا سکتا کہ (کسی کی بڑی) عمر ہو جائے
يُعَمَّرَ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿٩٦﴾ ع ۱۱
اور حق تعالیٰ کے سب پیش نظر ہیں اُن کے اعمال (بد)۔

موت کی آرزو کر کے دیکھو

"قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ" (آپ کہدیجئے کہ اگر عالم آخرت خاص تمہارے ہی لئے ہے دوسروں کو چھوڑ کر، تو موت کی آرزو کر دیکھو، اگر تم سچے ہو)۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں موجود یہودیوں پر اپنی حجت تمام کر دی ہے۔ ایک مرتبہ مدینہ میں نصاریٰ کی ایک جماعت نے آکر عیسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں حضور اکرم سے بحث اور کٹ حجتی کی تھی تو اس موقعہ پر بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا تھا کہ نصرانیوں کی اس جماعت کو مباہلہ کی دعوت دیں، اس آیت میں یہودیوں کے سلسلہ میں آنحضور کو اسی طرح کا حکم ہوا ہے کہ انھیں آپ سے جو اختلاف ہے اس کا فیصلہ کرنے کیلئے آپ کی وہ ایک ایسی بات مان لیں جس سے انھیں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے اور پھر سارے اختلافات کا خود ہی اللہ تعالیٰ فیصلہ کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ فریق ثانی یعنی یہودیوں سے فرماتا ہے کہ اگر تم حق پر ہو (جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے) تو پھر موت کی آرزو کر کے دیکھو، اگر تم واقعی حق پر ہوئے تو موت کی آرزو تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی، کیونکہ تمہیں اللہ سے قرب اور ایمان حقیقی کا دعویٰ ہے۔ بلکہ موت تو تمہارے لئے اور اس دنیا کی پریشانیوں اور تفکرات سے نجات کا باعث بن جائے گی تمہیں اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا جوار، اس کی خوشنودی اور آخرت کی نعمتیں ملیں گی۔ کیونکہ تمہارا تو بہرحال یہ عقیدہ ہے ہی کہ آخرت کی تمام نعمتوں کے تنہا صرف تمہیں مستحق ہو، ہم مسلمانوں کو اس میں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ اگر تمہارا یہ عقیدہ صحیح ہے تو پھر تمہیں سب سے پہلے اس کی تمنا کرنی چاہیئے۔ لیکن اگر تم موت کی آرزو نہیں کرتے تو سب پر یہ بات کھل جائے گی کہ تم حق پر نہیں ہو، بلکہ حق پر ہم ہیں۔ اسی پر ہمارے اور تمہارے فیصلہ کا دار و مدار ہے کہ تم موت کی آرزو کرتے ہو یا نہیں، لیکن یہودیوں نے اس چیلنج کو قبول نہیں کیا اور موت کی آرزو کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر انہوں نے موت کی آرزو کی تو وہ ہلاک و تباہ ہو جائیں گے اور دنیا کے ساتھ آخرت میں بھی ان کے لئے نامرادی اور ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں۔ نصاریٰ نے بھی جب مدینہ آکر عیسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ میں کٹ حجتی کی تھی اور آنحضور نے انھیں مباہلہ کی دعوت دی تھی تو انہوں نے بھی اس چیلنج کو قبول نہیں کیا تھا اور واپس چلے گئے تھے۔ یہ حدیث ہمیں معلوم ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگر یہودیوں نے اس آیت کے چیلنج کو قبول کر لیا ہوتا اور موت کی آرزو کر لی ہوتی تو سب مر جاتے اور جہنم میں اپنا ٹھکانا ہاتھوں ہاتھ دیکھ لیتے۔ اسی طرح جن عیسائیوں کو آپ نے دعوت مباہلہ دی تھی اگر وہ مباہلہ کر لیتے تو یقیناً جب وہ گھر واپس ہوتے تو نہ انھیں ان کے اہل و عیال ملتے اور نہ ان کے مال و اسباب کا کہیں پتہ چلتا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اگر اس آیت کے جواب میں یہودیوں نے موت کی آرزو کا اظہار کر دیا ہوتا تو سب مر جاتے۔ آپ ہی سے ایک روایت میں ہے کہ روئے زمین پر کوئی یہودی زندہ باقی نہ بچتا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو ایک دعوت دی تھی اور انہوں نے اس سے پھر کر ساری دنیا پر ثابت کر دیا کہ وہ حق پر نہیں تھے، نصرانیوں کو بھی اسی طرح کی ایک دعوت دی تھی اور انہوں نے بھی فرار اختیار کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرح اپنے دین حق کو سب کے سامنے واضح کر دیا اور کسی کیلئے اس سے انکار و اعراض کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی۔

جیسا کہ معلوم ہے، یہودی کہا کرتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے عزیز و محبوب ہیں، جنت میں یہودیوں کے سوا اور

Marfat.com

کوئی نہیں جائے گا۔ یہی دعویٰ عیسائیوں کا بھی تھا کہ نصاریٰ کے سوا کوئی جنت میں نہ جائے گا۔ اس لئے اللہ تعالےٰ نے یہودیوں کو موت کی آرزو کرنے کی دعوت دے کر اُن کے جھوٹ اور بے سروپا دعووں کا بھرم کھول دیا۔

مفسرین کے اس سلسلے میں کئی اقوال ہیں کہ یہودیوں سے اللہ تعالےٰ نے موت کی آرزو کرنے کے لئے کیوں کہا تھا؟ اور اُسکی صورت کیا تھی؟ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس کی صورت یہ تھی کہ دونوں فریقوں (مسلمانوں اور بنی اسرائیل) میں سے جو جھوٹا ہوتا اسی کے لئے بددعا کا انہیں حکم ہوا تھا کہ ان میں سے جو بھی جھوٹا ہو اس کے لئے تم موت کی آرزو کرو۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل کہا کرتے تھے کہ جنت میں تو صرف یہودی داخل ہوں گے، کہتے کہ ہم اللہ کے اولاد اور اس کے عزیز و محبوب ہیں۔ اس لئے ان سے کہا گیا کہ تم سچے ہو تو پھر موت کی تمنا کر کے دیکھو۔ لیکن انہوں نے اس چیلنج کو قبول نہیں کیا۔ یہ روایت ابو العالیہ اور ربیع رحمہا اللہ سے بھی منقول ہے۔ "قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً" کا مطلب یہ ہے کہ اے محمد! یہودیوں سے کہئے کہ آخرت کی نعمتیں اور وہاں کی لذتیں اگر صرف تمہارے ہی لئے ہیں۔ آیت میں صرف "الدَّارُ الْاٰخِرَةُ" (عالم آخرت) کہا، کیونکہ اس سے اس کی نعمتوں اور جنتوں کا مفہوم خود سمجھ میں آجاتا ہے۔ "خَالِصَةً" یعنی بے غبار، تنہا۔ بولتے ہیں "خَلَصَ لِیْ فُلَانٌ" یعنی فلاں چیز تنہا میرے لئے ہوگئی۔ "خَالِصَةً" "عَافِیَةً" کی طرح مصدر ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ "خَالِصَةً" کی تفسیر خاص سے کیا کرتے تھے لیکن یہ غریب ہے۔ "مِنْ دُوْنِ النَّاسِ" یعنی یہودی کہا کرتے تھے کہ عالم آخرت کی نعمتیں ہمارے ہی لئے ہیں۔ دوسرے تمام انسانوں کو چھوڑ کر" آیت کی ظاہری ترتیب سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس سلسلے میں بنی اسرائیل تمام بنی آدم کا استثنا کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالےٰ نے بھی ان کے متعلق ایک موقعہ پر فرمایا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جنت میں یہودیوں کے سوا اور کوئی نہیں داخل ہوگا۔ لیکن ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ آپ "مِنْ دُوْنِ النَّاسِ" کا مفہوم یہ بیان کرتے تھے کہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو چھوڑ کر" یعنی وہ کہا کرتے تھے کہ عالم آخرت کی نعمتیں انھیں کو ملیں گی۔ حضور اکرم اور آپ کے صحابہ کو نہیں ملیں گی۔ "فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ" یعنی موت کی آرزو کر کے دیکھو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "موت مانگ کے دیکھو" لیکن کلام عرب میں "تَمَنِّیْ" مانگنے اور سوال کرنے کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پیش نظر یہ تھا کہ "تَمَنِّیْ" میں بھی آرزو اور رغبت ہوتی ہے اور "سوال" میں بھی سائل کو رغبت ہوتی۔ اس اشتراک کی وجہ سے آپ نے "تمنی" کا ترجمہ بھی سوال کیا۔

"وَلَنْ یَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ بِالظّٰلِمِیْنَ" (لیکن وہ اس کی آرزو ہرگز کبھی بھی نہ کریں گے، بسبب اس کے جو یہ اپنے ہاتھوں سمیٹ چکے ہیں، اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے) اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے بتایا ہے کہ موت سے یہودی کانپتے ہیں، اس لئے حضور اکرم کے اس چیلنج کو کبھی قبول نہیں کریں گے اور موت کی آرزو ہرگز نہیں کریں گے۔ کیونکہ یہود اس حقیقت سے خوب واقف تھے کہ اگر انہوں نے موت کی آرزو کی تو اس سے بچ نہیں سکیں گے، وہ اس سے بھی لاعلم نہیں تھے کہ آنحضور واقعی اللہ کے نبی ہیں اور جتنی خبریں آپ نے دی ہیں وہ سب سچ ثابت ہو چکی ہیں۔ اس لئے اس کا بھی خوف تھا کہ اگر انہوں نے موت کی آرزو کی تو موت کی صورت میں اللہ کا عذاب ان کے اعمال بد کے بدلہ میں ان پر نازل ہو کے رہے گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ موت کی آرزو کبھی نہیں کریں گے بسبب اس کے جو یہ اپنے ہاتھوں سمیٹ چکے ہیں، یعنی بسبب اس کے کہ آپ کی نبوت کے متعلق یقینی علم کے باوجود وہ آپ سے کفر کرتے ہیں۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ یہودی موت سے سب سے زیادہ بھاگتے تھے، اور کبھی موت کی آرزو کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

"بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ" یعنی بسبب اس کے جو یہ اپنے ہاتھوں سمیٹ چکے ہیں۔ یہ عربی کا ایک مشہور و معروف محاورہ ہے کوئی شخص اگر کوئی جرم کرے اور اسے سزا دیجائے تو اس سے کہا جاتا ہے کہ "ذٰلِكَ بِمَا جَنَتْ یَدَاكَ" (یعنی یہ تمہارے ہاتھوں

Marfat.com

کی کرنی ہے) اس مفہوم کے لئے (بِمَا جَنَتْ يَدَاكَ کے بجائے) "بِمَا كَسَبَتْ يَدَاكَ" یا "بِمَا قَدَّمَتْ يَدَاكَ" بھی بولتے تھے. ضروری نہیں تھا کہ جرم کا ارتکاب مجرم نے ہاتھ (يَدٌ) ہی سے کیا ہو، دوسرے اعضا مثلاً زبان وغیرہ کے جرم پر بھی جو سزا اسے ملتی اس کے لئے بھی یہی محاورہ استعمال ہوتا ہے. وجہ یہ ہے کہ ہاتھ ہی سے اہم اور بڑے بڑے کام انجام پاتے ہیں، اس لئے کاموں کی نسبت کے لئے اسے ہی محاورہ میں استعمال کرنے لگے. آیت میں بھی یہی صورت ہے، ارشاد ہے کہ "لَنْ يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ" (یعنی وہ موت کی آرزو ہرگز کبھی نہیں کریں گے، بسبب اس کے جو یہ اپنے ہاتھوں سمیٹ چکے ہیں) آیت میں ان کے جن اعمال کیطرف اشارہ ہے اس کا تعلق ان کے دل سے تھا، کہ آنحضور کے حق ہونے اور آپ کے نبی مبعوث ہونے کے متعلق وہ دل سے یقین رکھتے تھے، خوب سمجھتے تھے لیکن اسے انہوں نے چھپا رکھا تھا، اسی طرح اس کا تعلق ان کی زبان سے تھا کہ حضور اکرم کے خلاف حسد و دشمنی کی وجہ سے، بولتے رہتے تھے اور آپ کی رسالت کا انکار کرتے رہتے تھے اور ان کے انھیں اعمال کیطرف اللہ تعالےٰ نے اشارہ ان الفاظ سے کیا ہے کہ "جو یہ اپنے ہاتھوں سمیٹ چکے ہیں" عرب زبان کے محاورات سے بخوبی واقف تھے اس لئے انھیں سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی. ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ سے آیت کے سلسلے میں روایت ہے کہ انھوں نے آنحضور کی رسالت کو پہچانا اور اس کے باوجود کفر کیا، یہی اُن کے اعمال تھے جنہیں ان کے ہاتھ سمیٹ چکے تھے. وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ "یعنی اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے، خواہ وہ یہودی ہوں، نصرانی ہوں یا کسی دوسرے مذہب والے ہوں ان کا کوئی عمل اور ان کا حسد سے تجاوز کرنا اللہ کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے. یہودیوں کا ظلم یہ تھا کہ اللہ کے حکم کے خلاف عمل کر کے اس سے کفر کرتے تھے اور اس کے باوجود کہ پہلے سے آنحضور کے ذریعہ فتح کی دعا مانگا کرتے تھے، جب آپ کی بعثت ہوئی تو انکار کر بیٹھے.

دل کا چور

"وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيَاةٍ" یعنی اے محمد! آپ دنیا کی زندگی پر حریص اور موت سے دور بھاگنے والا سب سے زیادہ ان یہودیوں کو پائیں گے ابو العالیہ، ربیع اور مجاہد رحمہم اللہ سے یہی روایت ہے. وہ موت سے سب سے زیادہ اس لئے گھبراتے تھے کہ اپنے اعمال کے بدلہ میں انھیں یقین تھا کہ آخرت میں ذلت و رسوائی اور عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا. "وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا" یعنی یہودی مشرکوں سے بھی بڑھ کر زندگی کے حریص ہیں" کیونکہ مشرکین آخرت کی زندگی اور حشر و نشر پر یقین نہیں رکھتے تھے اور اس کے مقابلہ میں یہودی ان چیزوں پر ایمان رکھتے تھے. اس لئے دنیاوی زندگی کی محبت اور موت سے فرار ان میں مشرکین سے بھی زیادہ موجود تھا. بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد مجوسی ہیں، کہ آپ یہودیوں کو اُن سے بھی زیادہ زندگی پر حریص پائیں گے.

ابو العالیہ اور ربیع رحمہما اللہ سے یہی روایت ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ نے مشرکین مراد لئے ہیں. آپ نے فرمایا کہ وجہ یہ تھی کہ مشرک موت کے بعد حشر و نشر میں یقین نہیں رکھتا، اس لئے وہ صرف اس کا خواہشمند ہوتا ہے کہ طویل زندگی دنیا میں ملجائے، لیکن یہودی آخرت میں اپنی اس رسوائی اور ذلت سے خوب واقف تھے اور خوب سمجھتے تھے کہ ان کے اعمال کا کیا بدلہ وہاں ملے گا. "يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ" سے مراد مشرکین ہیں جن کے مقابلہ میں یہودی زندگی پر زیادہ حریص ہیں. ان مشرکین کے متعلق ارشاد ہے کہ ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ چاہتے ہیں کہ کاش! ہزار برس کی عمر ملجائے، کبھی زندگی ختم ہی نہ ہو، دنیا میں جیسی کیسی بھی خوشی و مسرت انھیں حاصل ہے وہ کبھی ختم نہ ہو. ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مراد عجم کے مشرکین ہیں جو ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے وقت کہتے تھے کہ ہزار سال زندہ رہو" سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کے واسطہ سے ایک روایت میں ہے کہ اہل شرک کا یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی چھینکتا تو کہتے کہ "ہزار سال زندہ رہو" قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "گناہوں اور غلط کاریوں نے ان کے دل میں زندگی سے محبت پیدا کر دی تھی". اسی طرح کی روایات ابن ابی نجیح اور ابن زید رحمہما اللہ سے بھی ہیں. وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهِ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ "(حالانکہ اتنی عمر اگر وہ پا بھی جائے تو یہ امر اسے عذاب سے تو نہیں بچا سکتا) یعنی درازی عمر کسی انسان کو اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتی. "بِمُزَحْزِحِهِ" یعنی نکالنے والا، نجات دینے والا. "زَحْزَحَ" سے نکلا ہے، بمعنی دور کرنا، نکالنا. ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آیت کا

Marfat.com

مطلب یہ ہے کہ "درازی عمر، بہت دنوں تک زندہ رہ جانا کسی کو اللہ کے عذاب سے نجات نہیں دلادے گا" ابو العالیہ اور ربیع رحمہما اللہ سے بھی یہی روایت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ لوگ مراد ہیں جو جبرئیل علیہ السلام سے دشمنی رکھتے تھے (یعنی یہودی) ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی آیت کی یہی تفسیر منقول ہے۔" وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ "یعنی جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اسے خوب دیکھ رہا ہے، اس سے ان کی کوئی بات پوشیدہ نہیں۔ انہیں ان کے اعمال کا بدلہ ضرور دے گا۔ " بَصِيْرٌ " یعنی دیکھنے والا

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا

(آپ ان سے) یہ کہیے کہ جو شخص جبریل سے عداوت رکھے، سو انہوں نے یہ قرآن آپ کے قلب تک پہنچا دیا ہے۔ خداوندی حکم سے اس کی (خود) یہ حالت ہے کہ تصدیق کر رہا ہے

بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ○ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ

اپنے سے قبل والی (سماوی) کتابوں کی اور رہنمائی کر رہا ہے اور خوشخبری سنا رہا ہے ایمان والوں کو جو (کوئی) شخص خدا کا دشمن ہو اور فرشتوں کا (ہو) اور پیغمبروں کا (ہو)

وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ○

اور جبرئیل کا (ہو) اور میکائیل کا (ہو) تو (ان سب کا وبال یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ دشمن ہے ایسے کافروں کا۔

جبرئیل علیہ السلام سے دشمنی

" قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ " (آپ کہدیجئے کہ جو کوئی جبریل کا دشمن ہے تو انہوں نے اس کو آپ کے قلب پر اللہ کے حکم سے نازل کیا ہے) مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ آیت بنی اسرائیل کے یہودیوں کے جواب میں نازل ہوئی تھی، وہ کہتے تھے کہ جبریل (علیہ السلام) ہمارے دشمن ہیں، اور میکائیل علیہ السلام ہمارے ہمدرد اور بہی خواہ ہیں۔ البتہ اس سلسلے میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں کہ یہودی جبریل علیہ السلام کو اپنا دشمن کیوں سمجھتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی اور کہا کہ اے ابو القاسم! ہم آپ سے چند ایسی باتیں پوچھنا چاہتے ہیں جنھیں نبی کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ آنحضور نے فرمایا کہ جو تمہارا جی چاہے پوچھو، لیکن پہلے مجھ سے عہد کر لو کہ اگر میں نے تمہارے تمام سوالات کے جوابات صحیح صحیح دیدیئے اور تمہارے خیال کے مطابق بھی وہ صحیح ہوئے تو تم اسلام قبول کر لو گے۔ انہوں نے کہا کہ اس کا ہماری طرف سے وعدہ ہے۔ اس پر آنحضور نے فرمایا کہ پھر تمہارا جو جی چاہیئے پوچھو۔ انہوں نے پوچھا کہ چار چیزوں کے متعلق ہم آپ سے سوال کرنا چاہتے ہیں آپ ہمیں بتائیے کہ اسرائیل (یعقوب علیہ السلام) نے تورات نازل ہونے سے پہلے اپنے اوپر کون سا کھانا حرام کیا تھا؟ مرد اور عورت کے پانی کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ اولاد کبھی مذکر اور کبھی مؤنث کیوں پیدا ہوتی ہے؟ اور اس "نبی امی" کے متعلق ہمیں بتائیے جنکا ذکر تورات میں ہے اور یہ کہ ملائکہ میں سے ان کا دوست کون ہوگا؟ آنحضور نے پھر فرمایا کہ جو تم نے مجھ سے عہد کیا ہے وہ یاد رکھنا کہ اگر میں نے جوابات تمہیں ٹھیک ٹھیک دیدیئے تو تم ایمان لاؤ گے۔ انہوں نے بھی اپنے وعدہ پر قائم رہنے کا خوب یقین دلایا، پھر آنحضور نے فرمایا تمہیں میں اس ذات کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر توریت نازل کی، کیا تمہیں معلوم ہے کہ اسرائیل یعنی یعقوب علیہ السلام ایک مرتبہ شدید بیمار پڑے، جب بیماری نے طول کھینچا تو انہوں نے نذر مانی کہ اگر اللہ نے انھیں شفاء دیدی تو سب سے زیادہ مرغوب اور پسندیدہ کھانا اور مشروب اپنے اوپر حرام کر لیں گے۔ اور سب سے زیادہ انھیں اونٹ کا گوشت پسند تھا۔ مصنف کہتے ہیں کہ جہاں تک مجھے علم ہے انکا سب سے زیادہ مرغوب مشروب اونٹ کا دودھ تھا۔ اس پر وہ تمام یہودی بول پڑے، اللہ گواہ ہے، آپ نے بالکل ٹھیک بات بتائی پھر حضور اکرم نے فرمایا، میں تم پر اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور اس ذات کی تمہیں قسم دیتا ہوں جس نے تورات کو موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا، کیا تمہیں معلوم ہے کہ مرد کا پانی (منی) سفید اور گاڑھا ہوتا ہے، اور عورت کا پانی پتلا اور زرد ہوتا ہے اور ان میں سے جو بھی

Marfat.com

غالب رہتا ہے بچہ اس کے مشابہ پیدا ہوتا ہے، اگرچہ یہ بھی اللہ کے حکم پر منحصر ہے۔ پس اگر عورت کا پانی مرد کے پانی پر غالب آگیا تو لڑکی پیدا ہوگی اور اگر مرد کا پانی عورت کے پانی پر غالب آگیا تو لڑکا پیدا ہوگا اللہ کے حکم سے۔ یہ سن کر بھی انہوں نے کہا کہ اللہ گواہ ہے۔ آپ نے صحیح کہا۔ اس کے بعد آنحضور نے فرمایا کہ میں تم سے اللہ کا واسطہ دیکر پوچھتا ہوں، کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس "نبی اُمی" کی (جسکا ذکر توریت میں ہے) آنکھیں (نیند میں) سوتی ہیں، لیکن دل ہمیشہ بیدار رہتا ہے۔ اس پر بھی انہوں نے کہا کہ اللہ گواہ ہے، آپ نے سچ کہا۔ آنحضور نے فرمایا، اے اللہ! گواہ رہنا۔ اب یہودیوں نے کہا کہ ہمارا آخری فیصلہ اس پر موقوف ہے کہ فرشتوں میں آپ کا دوست کون ہے، اس جواب پر یا ہم آپ کے ساتھ ہوجائیں گے یا آپ سے جدا ہوجائیں گے۔ آنحضور نے فرمایا کہ میرے دوست جبریل علیہ السلام ہیں، اور اللہ نے جب کبھی اپنا رسول بھیجا تو انھیں کو ان کا دوست بنایا۔ یہودی اس پر بولے کہ پھر تو ہم آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اگر ان کے علاوہ کوئی اور فرشتہ آپ کا دوست ہوتا تو ہم آپ پر ضرور ایمان لاتے۔ آنحضور نے دریافت فرمایا کہ آخر بات کیا ہے کہ تم ان کی وجہ سے ایمان نہیں لاؤ گے؟ انہوں نے کہا کہ وہ ہمارے دشمن ہیں۔ اس پر اللہ تعالےٰ نے مذکورہ بالا آیات آخر تک نازل کیں۔ اسی طرح کی روایتیں شہر بن حوشب اشعری اور ابن ابی بنزہ سے بھی ہیں۔

اس سلسلے میں دوسرا قول یہ ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور یہودیوں کے درمیان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے سلسلے میں ایک مرتبہ بحث ہوئی تھی۔ اور آیت اسی پر نازل ہوئی ہے چنانچہ شعبی سے روایت ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ مقام "روحا" تشریف لے گئے (اپنے زمانہ خلافت میں) وہاں آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایک پتھر کے پاس پہنچنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے اور وہاں نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ کسی نے آپ کو بتایا کہ یہ لوگ ایسا اس لئے کر رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں ایک موقعہ پر نماز پڑھی تھی۔ لیکن عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے اس طرز عمل پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ کسی بھی وادی میں جب نماز کا وقت ہوجاتا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وہیں نماز پڑھ لیتے تھے، اور پھر وہاں سے کوچ کرتے تھے۔ اس کے بعد آپ لوگوں سے ایک حدیث بیان کرنے لگے۔ فرمایا کہ یہودیوں کا مذہبی درس جس دن ہوتا تو میں بھی وہاں جایا کرتا تھا اور توریت کے مضامین سنکر مجھے حیرت ہوتی تھی کہ کس طرح توریت، قرآن مجید کی تصدیق کرتی ہے اور اسی طرح قرآن مجید، توریت کی تصدیق کرتا ہے ——————

ایک دن میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو انہوں نے مجھ سے کہا، عمر! تمہارے تمام ساتھیوں میں تم سے زیادہ عزیز ہمیں کوئی نہیں ہے میں نے پوچھا کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ تم ہمارے پاس آتے جاتے ہو اور ہم سے تعلق رکھتے ہو۔ میں نے کہا کہ میں تو آتا ہوں اور یہ دیکھکر حیرت میں رہ جاتا ہوں کہ توریت کس طرح قرآن مجید کی تصدیق کرتی ہے اور اسی طرح قرآن مجید کس طرح توریت کی تصدیق کرتا ہے ——————

بیان کیا کہ اتنے میں ادھر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گذرے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ ابن خطاب! یہ تمہارے ساتھی جا رہے ہیں، انھیں کے ساتھ چلے جاؤ۔ لیکن میں نے ان سے کہا کہ میں تمہیں اللہ کی قسم دیکر پوچھتا ہوں، کیا تمہیں معلوم ہے کہ آنحضور اللہ کے رسول ہیں؟ اس پر وہ سب خاموش ہوگئے۔ ان میں جو سب سے بڑا عالم تھا اس نے کہا کہ عمر کی بات کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ انہوں نے کہا کہ آپ ہم میں سب سے زیادہ علم والے اور ہمارے سردار ہیں۔ آپ ہی انھیں جواب دیجئے۔ اس عالم نے مجھے یہ جواب دیا کہ جب تم نے اللہ کا واسطہ دیا ہے تو سنو کہ ہمیں معلوم ہے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اس پر میں نے کہا، افسوس ہے، پھر تو تم ہلاک و برباد ہوگئے (آپ کا انکار کر کے) اس عالم نے کہا کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ ہم تباہ و برباد ہوگئے۔ میں نے کہا کہ پھر اور کیا ہوا؟ تم خود کہتے ہو کہ آنحضور اللہ کے رسول ہیں، اور اس کے باوجود آپ کی تم نہ تصدیق کرتے اور نہ اتباع کرتے۔ انہوں نے کہا کہ اصل میں فرشتوں میں ایک ہمارا دشمن ہے اور ایک فرشتہ ہمارا دوست ہے، جو فرشتہ ہمارا دشمن ہے وہ تمہارے

Marfat.com

نبی کے ساتھ متعلق ہے،اسلئے ہم ان کی تصدیق نہیں کرتے۔ میں نے پوچھا کہ کون تمہارا دشمن ہے اور کون دوست ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہمارا دشمن جبریل (علیہ السلام) ہے اور ہمارے دوست میکائیل (علیہ السلام) ہیں۔ میں نے پوچھا جبریل علیہ السلام سے کس بات پر تمہاری دشمنی ہوگئی۔ اور میکائیل علیہ السلام کس طرح تمہارے دوست بن گئے؟ وہ کہنے لگے کہ جبریل (علیہ السلام) تنگی، تشدد، سختی اور عذاب کے فرشتہ ہیں۔ اس کے برعکس میکائیل (علیہ السلام) نرمی، رحمت اور تخفیف کے فرشتہ ہیں! میں نے پوچھا، اچھا تمہارے نزدیک ان دونوں فرشتوں کا اللہ رب العزت کی بارگاہ میں کیا مرتبہ ہے؟ کہنے لگے کہ ان میں سے ایک اللہ کے دائیں طرف کھڑا رہتا ہے اور دوسرا بائیں طرف میں نے اس پر کہا کہ اس اللہ کی قسم جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں، پھر وہ دونوں فرشتے اور وہ ذات جو (تمہارے خیال کے مطابق) ان کے درمیان میں ہے (یعنی اللہ تعالےٰ) ان کے دشمن ہیں جو ان میں سے کسی سے دشمنی رکھے اور جو ان سب کو مانتے ہیں انھیں، وہ بھی عزیز اور اپنا دوست رکھتے ہیں۔ ممکن نہیں کہ جبریل علیہ السلام کسی ایسے شخص کو اپنا دوست بنائیں جو میکائیل علیہ السلام سے دشمنی رکھتا ہو اور نہ میکائیل علیہ السلام ایسے شخص کو دوست بنا سکتے ہیں جو جبریل علیہ السلام سے دشمنی رکھتا ہو۔ اس کے بعد میں کھڑا ہوگیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے چل کر آپ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ آنحضور نے مجھے دیکھ کر فرمایا کہ ابھی چند آیتیں مجھ پر نازل ہوئی ہیں اور پھر آپ نے مذکورہ بالا آیتیں "آپ کہدیجئے کہ جو کوئی جبریل کا دشمن ہے تو انہوں نے تو اس قرآن کو آپ کے قلب پر اللہ کے حکم سے اتارا ہے" آخر آیات تک میں نے عرض کی، یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں تو اس غرض سے اسوقت حاضر خدمت ہوا تھا کہ آپ کو ایک واقعہ کی اطلاع دوں گا، لیکن اللہ لطیف وخبیر نے مجھ سے پہلے ہی اس کی اطلاع آپکو دیدی ہے یہ روایت قتادہ، سدی، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ اور عطاء رحمہم اللہ سے بھی اختصار کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔ "مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ" کا مفہوم یہ ہے کہ اے محمد! بنی اسرائیل کے یہودی جبکہ یہ خیال ہے کہ جبریل ان کے دشمن ہیں۔ کیونکہ وہ عذاب، غضب اور سزا کے فرشتہ ہیں۔ وحی و رحمت کے وہ فرشتہ نہیں ہیں اور اس لئے وہ آپ کی اتباع سے گریز کرتے ہیں۔ آپ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں اور صرف اس لئے کہ جبریل آپ کے رفیق اور دوست ہیں اور وہ میری وحی آپ تک پہنچاتے ہیں، ان تمام آیات اور نشانیوں کے منکر ہیں جو میری طرف سے نازل ہوئی ہیں، تو آپ ان سے کہدیجئے کہ میں جبریل کا دوست ہوں اور صرف میری ہی طرف نہیں بلکہ پچھلے تمام انبیاء اور رسولوں کی طرف اللہ کی وحی وہی لیکر آتے رہے ہیں اور وہی میرے قلب پر بھی اللہ کے حکم سے وحی نازل کرتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور قتادہ اور ربیع رحمہما اللہ سے اسی طرح روایت ہے۔

"نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ" یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر قرآن کو اتارا ہے۔

۱؎ اس سائنٹفک دور میں کون سمجھ سکتا ہے کہ آج سے تیرہ سو سال پہلے بحث و مباحثہ میں کس طرح کے دلائل سے مخالف فریق کو قائل کیا جاسکتا تھا اور اس دور میں لوگوں کے سوچنے کا انداز کیا تھا۔ بنی اسرائیل میں صدیوں سے نبوت و رسالت چلی آرہی تھی اور وحی، جنت و دوزخ اور فرشتوں کے متعلق ان کے خاص نظریات تھے اور سینکڑوں قسم کی تحریف و تبدیلی کے بعد ان کے ان معتقدات نے ایک ایسی صورت اختیار کر لی تھی جو ان کے مزاج اور ان کے ماحول سے بھی پوری طرح مطابقت رکھتی تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور آپ سے کفر کی وہ مختلف وجوہ بیان کرتے تھے اور ایک میں بھی معقولیت نہیں ہوتی تھی۔ قرآن ان کے ان معتقدات کی تردید کرتے ہوئے ان کی اسی نامعقول روش کو موثر انداز میں بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ نبوت و رسالت اور اس پر ایمان سے متعلق جتنے بھی امور ہیں ان سب کا تعلق غیب سے ہے اور ذہنی طور پر اہل کتاب ان سے دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ قریب بھی تھے اور واقفیت بھی رکھتے تھے اس کے علاوہ ان چیزوں میں اہل کتاب کے رد عمل کا اثر بھی قبول کیا جاتا تھا، اسی لئے قرآن مجید نے جگہ جگہ انھیں مخاطب کیا ہے اور حق اور سچائی کو ان کے سامنے رکھا ہے۔ (مترجم)

Marfat.com

"جبرئیل" کو عرب کئی طرح سے پڑھتے تھے۔ اہل حجاز "جبریل"، "میکائیل" پڑھتے ہیں، اہل مدینہ اور اہل بصرہ کی بھی عام قرأت یہی ہے۔ قبیلہ تمیم، قیس اور بعض نجد کے قبائل "جبرئیل، میکائیل" جیم اور را پر زبر ہمزہ اور اس کے بعد یا کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ کوفہ کی عام قرأت یہی ہے۔ "جبرِیل" جس میں جیم پر تو زبر ہو، لیکن یا سے پہلے ہمزہ نہ ہو۔ یہ قرأت جائز نہیں ہے، اس لئے کہ کلام عرب میں اس وزن کا کوئی لفظ وجود نہیں ہے۔ قبیلہ بنو اسد "جبرین" نون کے ساتھ پڑھتے تھے۔ بعض اہل عرب سے "جبرائیل، میکائیل" الف کے اضافہ کے ساتھ بھی سنا گیا ہے، یحیٰ بن یعمر "جبرئلّ" پڑھتے تھے۔ سریانی زبان میں جبر اور میک کا معنی "غلام" ہے اور ائیل بمعنی اللہ (یعنی اللہ کا بندہ) سعید بن جبیر، عکرمہ، علی بن حسین رحمۃ اللہ علیہم سے یہی روایت ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی روایت ہے۔ علی بن حسین نے فرمایا کہ جو اسم بھی "ائیل" کی طرف منسوب ہو کے ذکر ہو گا اس کا مفہوم یہی ہو گا کہ اللہ کی عبادت و بندگی کرنے والا۔ لیکن جن حضرات نے "جبرئلّ" پڑھا ہے ان کے نزدیک "آلّ" عربی لفظ ہو گا بمعنی اللہ وہ کہتے ہیں کہ "لَا یَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً" (کسی مومن کے باب میں یہ لوگ نہ قرابت کا پاس کریں اور نہ قول و قرار کا) میں بھی یہی معنی مراد لیا گیا ہے۔

"مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ" یعنی قرآن سے پہلے جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے آسمانی کتابیں نازل ہو چکی ہیں، قرآن مجید ان سب کی تصدیق کرنے والا ہے۔ تصدیق کا مفہوم یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے حکم سے متعلق اور اس شریعت سے متعلق جسے آپ لیکر مبعوث ہوئے تھے، قرآن مجید کے مضامین پچھلی تمام آسمانی کتابوں کے مضامین کے مطابق ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ کتابیں جو قرآن مجید سے پہلے نازل ہوئی تھیں اور وہ انبیاء جو آنحضور سے پہلے تھے، مثلاً موسیٰ، ھود، شعیب، صالح علیہم السلام اور دوسرے انبیاء، قرآن ان سب کی تصدیق کرتا ہے۔ قتادہ اور ربیع رحمۃ اللہ علیہما سے بھی روایت ہے کہ قرآن مجید، توریت و انجیل کی تصدیق کرتا ہے۔

"وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِیْنَ" (اور ہدایت ہے اور ایمان والوں کے لئے خوشخبری ہے) "هُدًى" کے معنی ہیں دلیل و برہان۔ قرآن مجید کو اللہ تعالےٰ نے "هُدًى" اس لئے کہا کہ مومنین اس کے ذریعہ ھدایت اور سیدھا راستہ پاتے ہیں، حلال و حرام اور اللہ کا حکم و نہی اسی سے معلوم ہوتا ہے۔ "هَادِی" (جو هُدًى کا اسم فاعل ہے) کسی بھی چیز کا وہ ہوتا ہے جو اس سے آگے ہو، اسی لئے ان گھوڑوں کو جو دوسرے گھوڑوں سے بڑھ جائیں "هَوَادِی" کہتے ہیں۔ گردن کو بھی "هَادِی" اسی مناسبت سے کہتے ہیں کہ وہ تمام جسم سے اوپر ہوتی ہے۔ "بُشْرٰى" یعنی بشارت و خوشخبری۔ اللہ تعالےٰ اپنے مومن بندوں سے کہتا ہے کہ قرآن مجید اس کی طرف سے ان کے لئے خوشخبری ہے، اس لئے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ نے جنت اور اس کی نعمتوں کی تفصیلات بیان کی ہیں جو اس نے اپنے مومن بندوں کیلئے آخرت میں تیار کر رکھی ہیں اور جو اس دنیاوی زندگی کے ختم ہونے کے بعد مومنوں کو دی جائیں گی۔ "بشارت" کا مفہوم کلام عرب میں یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسی اچھی خبر سنائی جائے جس کا علم اسے پہلے سے نہ ہوا اور نہ اس سے پہلے اس نے یہ خبر اس کے علاوہ کسی اور سے سنی ہو۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ قرآن مجید ھدایت اور مومنوں کے لئے خوشخبری اس لئے ہے کہ مومن جب قرآن سنتا ہے تو اسے پوری طرح یاد کر لیتا ہے اور اس کے مضامین سے فائدہ حاصل کرتا ہے اور اسے اطمینان حاصل ہو جاتا ہے، اللہ تعالےٰ نے جو وعدے اس میں کئے ہیں دل سے ان کی تصدیق کرتا ہے اور اسے یقین ہو جاتا ہے کہ ایسا ہی ہو گا۔

اللہ کافروں کا دشمن ہے

"مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِیْلَ وَمِیْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِیْنَ" (جو کوئی دشمن ہو اللہ کا یا اس کے فرشتوں کا یا اس کے پیغمبروں کا یا جبریل کا یا میکائیل کا تو اللہ بھی بالیقین دشمن ہے کافروں کا) آیت میں لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ جو شخص اللہ، اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں سے دشمنی رکھتا ہے تو بلاشبہ اللہ تعالےٰ بھی اس کا دشمن ہے، جبرئیل علیہ السلام یا کسی فرشتے سے دشمنی اللہ سے دشمنی ہے کیونکہ فرشتے اور انبیاء اس کے ولی اور اس کے فرمانبردار بندے ہیں، پس جو شخص اللہ کے ولی کا دشمن ہے وہ براہ راست اللہ کا دشمن ہے اور اس قادر و توانا سے برسرپیکار ہونا چاہتا ہے۔ اسی طرح جو شخص اللہ کا دشمن ہے وہ اس کے تمام اولیاء اور فرمانبردار بندوں کا

Marfat.com

دشمن ہے۔ آیت میں خطاب خاص یہودیوں سے ہے جو کہتے تھے کہ جبریل ہمارے دشمن ہیں اور میکائیل ہمارے دوست ہیں۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ یہ غلط ہے، جبریل سے دشمنی رکھنے والے کو اللہ اور اس کا کوئی فرشتہ اپنا دوست نہیں رکھ سکتا، جو لوگ جبریل علیہ السلام سے دشمنی رکھتے ہیں وہ تمام ملائکہ، انبیاء اور اللہ سے دشمنی رکھتے ہیں۔ اللہ کے کسی رسول، فرشتہ یا ولی کا دشمن اللہ اور اس کے تمام اولیاء کا دشمن ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ یہودیوں سے پوچھا کہ میں اس کتاب کی قسم دیکر تم سے پوچھتا ہوں جسے تم پڑھتے ہو، کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ تمہاری اس کتاب میں میری بشارت عیسٰی بن مریم علیہما السلام نے دی ہے کہ تمہارے پاس ایک رسول آئے گا جسکا نام "احمد" ہوگا۔ انہوں نے کہا، اللہ گواہ ہے، ہمیں معلوم ہے، لیکن ہم آپ کو اس لئے پسند نہیں کرتے کہ آپ مال غنیمت کو حلال کرتے ہیں اور خون بہانا جائز ٹھہراتے ہیں۔ اس پر آیت مذکورہ بالا نازل ہوئی۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک یہودی عمر رضی اللہ عنہ سے ملا اور کہنے لگا کہ جبریل، جنکا ذکر تمہارے نبی کیا کرتے ہیں ہمارے دشمن ہیں، عمر رضی اللہ عنہ نے مذکورہ بالا آیات کے الفاظ کے ساتھ اس یہودی کا جواب دیا اور پھر آپ کی تصدیق میں یہ آیت نازل ہوئی۔

ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت یہودیوں کی طرف سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار پر انہیں تنبیہ کرنے کے لئے نازل ہوئی تھیں، یعنی جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن ہے تو اللہ اس کا دشمن ہے۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ۝ اَوَكُلَّمَا

اور ہم نے تو آپکے پاس بہت سے دلائل واضحہ نازل کئے ہیں اور (قاعدہ کلیہ ہے کہ) کوئی انکار نہیں کیا کرتا ایسے دلائل کا مگر صرف وہی لوگ جو عدول حکمی کے عادی ہیں۔ ان لوگوں نے

عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَ

کوئی عہد کیا ہوگا (ضرور) اسکو ان میں سے کسی نہ کسی فریق نے نظر انداز کر دیا ہوگا بلکہ ان میں زیادہ تو ایسے ہی نکلینگے (جو میرے سے اس عہد کا) یقین ہی نہیں رکھتے۔ اور جب

لَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ

ان کے پاس ایک (عظیم الشان) پیغمبر آئے اللہ کی طرف سے جو تصدیق بھی کر رہے ہیں اس کتاب کی جو ان لوگوں کے پاس ہے (یعنی تورات

مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ

کی ان اہل کتاب میں سے ایک فریق نے خود اس کتاب اللہ ہی کو پس پشت ڈال دیا جیسے ان کو گویا (اس کے مضمون کا) اصلا علم نہیں۔

روشن نشانات کا انکار نافرمان ہی کر سکتا ہے

"وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ" یعنی اے محمد ہم نے آپ پر روشن اور واضح علامتیں اتاری ہیں جن سے ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ آپ کی نبوت برحق ہے۔ یہ روشن علامتیں وہ مضامین ہیں جو قرآن مجید میں موجود ہیں اور جن متعلق یہودیوں کا یقین تھا کہ نبی کے سوا انہیں اور کوئی نہیں جانتا، یا پھر ان کے وہ علماء و احبار جانتے تھے جو اپنی کتاب اور اپنی تاریخ کے ان رازہائے سربستہ سے واقف تھے جن کا ذکر ان کی کتابوں میں ہوا تھا لیکن ان کے اسلاف نے ان میں تحریف تبدیلی کر دی تھی۔ اللہ تعالےٰ نے ان کے تمام سربستہ رازوں کو قرآن مجید میں بیان کر دیا۔ اگر ان کے دل میں قومی عصبیت حسد و بغض نہ ہوتا تو قرآن مجید کے واضح اور صاف بیانات ان کے ایمان کے لئے کافی ہوتے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ مطلب یہ ہے کہ "آپ امی ہیں، آپ نے کوئی کتاب نہیں پڑھی ہے۔ اس کے باوجود آپ ان کی ایک حرکت سے پردہ فاش کرتے ہیں، کیا نبی کے سوا کوئی بھی شخص ایسی باتیں بتا سکتا ہے؟" آپ سے ایک روایت میں ہے کہ ابن

Marfat.com

صوریا یہودی نے آنحضور سے ایک مرتبہ کہا کہ آپ کی کسی بات کا ہمیں علم نہیں اور نہ آپ کوئی روشن علامت رکھتے ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ "وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ إِلَّا الْفَاسِقُونَ" (اور ان سے کوئی بھی انکار نہیں کرتا، بجز نافرمانوں کے) آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے آپ پر وحی کے ذریعہ روشن علامات اتاری ہیں اور وہ سب یہودیوں کے علماء و احبار کے لئے جانی پہچانی ہیں اور اس کا ثبوت ہیں کہ واقعی آپ ہماری طرف سے رسول ہیں۔ اور ان آیات و علامات اور آپ کی نبوت کا انکار نافرمان ہی کر سکتا ہے۔ جیسے اپنے دین اور اپنی کتاب کی بھی پرواہ نہیں[1]۔ لیکن انھیں میں جو لوگ دیندار ہیں اور اپنی کتاب اور اپنے نبی کے بتائے ہوئے رستے پر چلتے ہیں وہ میری ان آیات کی تصدیق کرتے ہیں جو میں نے آپ پر نازل کی ہیں۔ بنی اسرائیل ہی کا یہ وہ طبقہ ہے جو اللہ پر ایمان لایا تھا اور آپ کے رسالت کی تصدیق کی تھی۔

"أَوَكُلَّمَا عَاهَدُوا عَهْدًا نَّبَذَهُ فَرِيقٌ مِّنْهُم بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ" (کیا یہ ہے کہ انہوں نے جب کبھی بھی کوئی عہد کیا ہے تو انہی میں سے کسی جماعت نے توڑ ہی پھینکا ہے، اصل یہ ہے کہ ان میں سے زیادہ تر اعتقاد ہی نہیں کرتے) "عَهْد" سے مراد وہ وعدہ ہے جو اللہ رب العزت نے بنی اسرائیل سے بار بار لیا تھا کہ توریت پر عمل کرو گے، لیکن انہوں نے ہمیشہ وعدہ خلافی کی تھی۔ اللہ تعالیٰ انھیں زجر و توبیخ کر رہا ہے کہ تمہارے اسلاف نے جس طرح توریت پر عمل کے سلسلے میں عہد شکنی کی تھی، تم بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کفر کر کے انھیں کے نقش قدم پر چل رہے ہو۔ توریت میں آنحضور پر ایمان کا بھی تم سے وعدہ لیا گیا تھا اور آپ کے اوصاف اس میں بیان کر دیئے گئے تھے، تم آج ان اوصاف کا انکار کرتے ہو اور انھیں چھپاتے ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اور یہودیوں کو اپنے اوپر ایمان کا اللہ سے وعدہ یاد دلایا تو مالک بن صیف یہودی نے کہا کہ خدا کی قسم محمد کے متعلق ہم سے کوئی وعدہ نہیں لیا گیا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

"نَبَذَ" کا مفہوم ہے "پھینکنا" جو بات زبان سے نکل جائے اسے بھی "فَنَبَذْتُهُ" اس مناسبت سے کہتے ہیں "نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنْهُم" کا مفہوم یہ ہے کہ انھیں میں سے ایک جماعت نے اللہ کے عہد کو پھینک دیا یعنی عہد شکنی کی اور چھوڑ دیا۔ قتادہ اور ابن جریج رحمہما اللہ سے اسی طرح تفسیر منقول ہے۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ان کی عہد شکنی اور وعدہ خلافی کا یہ عالم تھا کہ جو عہد بھی کرتے اسے ضرور توڑ دیتے، آج کسی سے عہد و پیماں کیا اور کل توڑ دیا یہ اُن کی عادت بن چکی تھی۔ "فَرِيقٌ" بمعنی جماعت۔ "مِّنْهُم" سے مراد بنی اسرائیل کے یہودی ہیں، "بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ"۔ یعنی یہ لوگ جن کا معمول بن چکا ہے کہ جب کوئی عہد و پیمان کرتے ہیں تو اسے انھیں میں سے ایک جماعت توڑ دیتی ہے۔ ان میں سے زیادہ تر ایسے ہیں جو ایمان نہیں رکھتے۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ ان عہد شکنی کرنے والوں اور حق کو جھٹلانے والوں میں اکثر سرے سے ایسے ہیں۔ جو ایمان نہیں رکھتے کہ انہوں نے کبھی اس طرح کا کوئی عہد و پیماں کیا بھی تھا۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ اللہ، اس کے انبیاء اور اس کے وعدہ و عہد کی تصدیق ہی نہیں کرتے اور نہ ان پر ان کا کوئی ایمان ہے۔

---

[1] لیکن دوسرے مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ "آیات" عام ہیں۔ اس لئے اس سے قرآن مجید، معجزات، کتب سابقہ پر اطلاع، قرآن کا قانونی نظام اور اس سے متعلق تمام ہی چیزیں مراد لینی چاہئیں۔ یہودی اپنے پیغمبروں کے معجزات کے عادی تھے، بار بار یہی مطالبہ کرتے تھے کہ یہ کیسے نبی ہیں، کوئی نشانی کیوں نہیں دکھاتے۔ ارشاد ہے کہ تم ایک نشانی کو کہتے ہو، یہاں تو متعدد نشانیاں تمہاری سامنے لائی جا چکی ہیں اور وہ بھی مخفی اور پوشیدہ نہیں بلکہ کھلی ہوئی اور روشن، لیکن تم تو کفر و انکار کے عادی ہو۔ (مترجم)

Marfat.com

"وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ" یعنی جب ان علماء و احبار یہود کے پاس رسول اللہ کیطرف سے آئے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آیت میں "رسول" سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ "مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ" یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تصدیق کرتے ہیں تورات کی (جو ان کے پاس موجود ہے) اور تورات اُن کی تصدیق کرتا ہے کہ واقعی آپ اللہ کے نبی اور تمام مخلوق کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ "لِّمَا مَعَهُمْ" سے مراد ہے وہ کتاب جو ان کے پاس ہے یعنی تورات۔ مطلب یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے آئے، کتاب الٰہی تورات کی تصدیق کے ساتھ جو ان یہودیوں کے پاس موجود ہے تو "نَبَذَ فَرِيقٌ" یعنی ایک جماعت اس کا انکار کر بیٹھی، حالانکہ پہلے وہ خود اس کا اقرار کرتے تھے "مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ" یعنی انکار کرنے والے علماء یہود تھے جنھیں اللہ نے کتاب الٰہی کا علم دیا تھا۔ "كِتَابَ اللَّهِ" سے مراد توریت ہے۔ "وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ" کا تعلق "نَبَذَ كَا" سے ہے۔ یعنی انہوں نے اسے پس پشت پھینک مارا۔ یہ ایک محاورہ ہے، ہر اس موقعہ پر استعمال کرسکتے ہیں جب کوئی شخص کسی مفید کام کو چھوڑ دے، اعراض اور صرف نظر کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ مطلب یہ ہے کہ "جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آئے تو انہوں نے آپ کی مخالفت کی، حالانکہ قرآن مجید اور تورات کے مضامین میں اختلاف نہیں تھا لیکن انہوں نے تورات کو بھی چھوڑ دیا اور آصف کی کتاب اور ہاروت و ماروت کے جادو کو اختیار کرلیا۔ اسی لئے ان کے متعلق فرمایا کہ "كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ" یعنی یہ علماء یہود جنھوں نے اللہ کے عہد کو توڑ دیا ہے اور اس کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ ان کا عمل ایسا ہے جیسے یہ جانتے ہی نہیں کہ انہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا بھی حکم اللہ نے دیا تھا۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء یہود آنحضور کے نبی برحق ہونے کو جانتے تھے لیکن اس کے باوجود انکار کرتے تھے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روا

رعایتی اعلان

مندرجہ ذیل کتابوں پر ممبران تفسیر ابن جریر کو فی روپیہ چار آنے کی رعایت دی جائے گی۔ اس کے علاوہ ممبران کو دوسری کتابیں بھی ہمارے مکتبہ سے خصوصی رعایت کے ساتھ بھیجی جاتی ہیں۔

قرآن کیا سکھاتا ہے؟ اس کتاب میں اللہ، اس کی صفات، انسان، اس کا درجہ و مرتبہ، رسالت، قرآن اور آسمانی کتابیں، قیامت، ایمان وکفر طاعت وعبادت اخلاق، معاملات زندگی اور دوسرے بہت سے عنوانات پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور دکھایا گیا ہے کہ شروع سے آخر تک انسان کی زندگی میں، اس کے عقیدہ اور عمل میں قرآن مجید کی کیا تعلیمات ہیں اور وہ کس درجہ فطری اور حق ہیں۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔ رعایتی قیمت ایک روپیہ پانچ آنے۔

کرامات صحابہ اس کتاب میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی کرامات کی تفصیلات درج کی گئی ہیں۔ خلفاء راشدین اور تمام اکابر صحابہ کے حالات وکرامات پر یہ کتاب حاوی ہے۔ آخر میں ایک جن صحابی رضی اللہ عنہ کی بھی کرامت ذکر کی گئی ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ رعایتی قیمت ایک روپیہ دو آنے۔

میری نماز نماز کی فضیلت اس کی حقیقت، پانچوں وقت کی نمازیں کیوں فرض کی گئی ہیں۔ پانچ وقت کی نماز میں صرف سترہ رکعتیں ہی کیوں فرض ہیں؟ جماعت، اس کا حکم، اسکے چھوڑنے والے پر وعید، فرض نماز سے متعلق تمام ہی احکام پر یہ کتاب حاوی ہے وضو، غسل اور نماز کے فرائض، واجبات، سنن ومستحبات احکام کا آخر میں ذکر ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔ رعایتی بارہ آنے۔

ملنے کا پتہ:- بیت الحکمت دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔ پی) انڈ

(زیر نگرانی منشی رفیق احمد یونین پرنٹنگ پریس دہلی)

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ھٰذا کتٰب انزلنٰہ مبٰرک

تفسیر ابن جریر (اردو)

تالیف

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری

ترجمہ قرآن شریف

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

اردو ترجمانی

ظہور الباری اعظمی

پارہ اوّل کا جزء دوم

شائع کردہ

بیت الحکمت دیوبند (یو۔پی)

(جملہ حقوق بنام بیت الحکمت محفوظ ہیں)

Marfat.com